ساعتِ امکاں

عرفان ستار

ساعتِ امکاں

عرفان ستار

ایک ملال تو ہونے کا ہے، ایک نہ ہونے کا غم ہے
شہرِ وجود سے بابِ عدم تک، ایک سا ہُو کا عالم ہے

کتاب کا نام : ساعتِ امکاں

شاعر : عرفان ستار

سنہ اشاعت : 2016

مطبع :

قیمت : 150/

ناشر : دھلیز [illegible]کیشنز

ISBN : 978-81-928061-4-3

فہرست

ساعتِ امکاں

❊❊

مجلسِ غم نہ کوئی بزمِ طرب، کیا کرتے
گھر ہی جا سکتے تھے آوارۂ شب، کیا کرتے

یہ تو اچھا کیا، تنہائی کی عادت رکھی
تب اِسے چھوڑ دیا ہوتا، تو اب کیا کرتے

روشنی، رنگ، مہک، طائرِ خوش لحن، صبا
تُو جو آتا نہ چمن میں تو یہ سب کیا کرتے

دل کا غم دل میں لیے لوٹ گئے ہم چپ چاپ
کوئی سنتا ہی نہ تھا شور و شغب کیا کرتے

ساعتِ امکاں

کچھ کیا ہوتا تو پھر زعم بھی اچھا لگتا
ہم زیاں کار تھے، اعلانِ نسب کیا کرتے

دیکھ کر تجھ کو سرہانے ترے بیمارِ جنوں
جاں بلب تھے، سو ہوئے آہ بلب، کیا کرتے

تُو نے دیوانوں سے منہ پھیرلیا، ٹھیک کیا
اِن کا کچھ ٹھیک نہیں تھا کہ یہ کب کیا کرتے

یہی ہونا تھا جو عرفاؔن ترے ساتھ ہُوا
منکرِ میر بھلا تیرا ادب کیا کرتے

ساعتِ امکاں

یہ کیسے ملبے کے نیچے دبا دیا گیا ہوں
مجھے بدن سے نکالو، میں تنگ آ گیا ہوں

کسے دماغ ہے بے فیض صحبتوں کا میاں
خبر اُڑا دو کہ میں شہر سے چلا گیا ہوں

مآلِ عشقِ انا گیر ہے یہ مختصراً
میں وہ درندہ ہوں جو خود کو ہی چبا گیا ہوں

کوئی گھڑی ہے کہ ہوتا ہوں آستین میں دفن
میں دل سے بہتا ہُوا آنکھ تک تو آ گیا ہوں

ساعتِ امکاں

مرا تھا مرکزی کردار اِس کہانی میں
بڑے سلیقے سے بے ماجرا کیا گیا ہوں

وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے عجب تحیّر سے
نجانے چھونک میں کیا کچھ اُسے بتا گیا ہوں

مجھے بھلا نہ سکے گی یہ رہگزارِ جنوں
قدم جما نہ سکا، رنگ تو جما گیا ہوں

سب اہتمام سے پہنچے ہیں اُس کی بزم میں آج
میں اپنے حال میں سرمست و مبتلا گیا ہوں

مرے کہے سے مرے گرد و پیش کچھ بھی نہیں
سو جو دکھایا گیا ہے وہ دیکھتا گیا ہوں

ساعتِ امکاں

اُسے بتایا نہیں ہجر میں جو حال ہُوا
جو بات سب سے ضروری تھی وہ چھپا گیا ہوں

غزل میں کھینچ کے رکھ دی ہے اپنی جاں عرفانؔ
ہر ایک شعر میں دل کا لہو بہا گیا ہوں

ساعتِ امکاں

دنیا سے دُور ہو گیا، دیں کا نہیں رہا
اس آگہی سے میں تو کہیں کا نہیں رہا

رگ رگ میں موجزن ہے مرے خوں کے ساتھ ساتھ
اب درد صرف قلبِ حزیں کا نہیں رہا

دیوار و در سے ایسے ٹپکتی ہے بے دلی
جیسے مکان اپنے مکیں کا نہیں رہا

تُو وہ مہک، جو اپنی فضا سے بچھڑ گئی
میں وہ شجر جو اپنی زمیں کا نہیں رہا

ساعتِ امکاں

سارا وجود محوِ عبادت ہے سر بسر
سجدہ مرا کبھی بھی جبیں کا نہیں رہا

پاسِ خرد میں چھوڑ دیا کوچۂ جنوں
یعنی جہاں کا تھا میں وہیں کا نہیں رہا

وہ گرد بادِ وہم و گماں ہے، کہ اب مجھے
خود اعتبار اپنے یقیں کا نہیں رہا

اب وہ جواز پوچھ رہا ہے گریز کا
گویا محل یہ صرف نہیں کا نہیں رہا

میرا خدا ازل سے ہے سینوں میں جا گزیں
وہ تو کبھی بھی عرشِ بریں کا نہیں رہا

ساعتِ امکاں

ہر ذرّۂ زمیں کا دھڑکتا ہے اس میں غم
دل کو مرے ملال یہیں کا نہیں رہا

آخر کو یہ سنا تو بڑھا لی دکانِ دل
اب مول کوئی لعل و نگیں کا نہیں رہا

عرفانؔ، اب تو گھر میں بھی باہر سا شور ہے
گوشہ کوئی بھی گوشہ نشیں کا نہیں رہا

ساعتِ امکاں

کہے دیتا ہوں، گو ہے تو نہیں یہ بات کہنے کی
تری خواہش نہیں دل میں زیادہ دیر رہنے کی

بچا کر دل گزرتا جا رہا ہوں ہر تعلق سے
کہاں اِس آبلے کو تاب ہے اب چوٹ سہنے کی

رگ و پے میں نہ ہنگامہ کرے تو کیا کرے آخر
اجازت جب نہیں اِس رنج کو آنکھوں سے بہنے کی

بس اپنی اپنی ترجیحات، اپنی اپنی خواہش ہے
تجھے شہرت کمانے کی، مجھے اک شعر کہنے کی

ساعتِ امکاں

جہاں کا ہوں، وہیں کی راس آئے گی فضا مجھ کو
یہ دنیا بھی بھلا کوئی جگہ ہے میرے رہنے کی

جو کل عرفانؔ پر گزری سنا کچھ اُس کے بارے میں
خبر تم نے سنی طوفان میں دریا کے بہنے کی
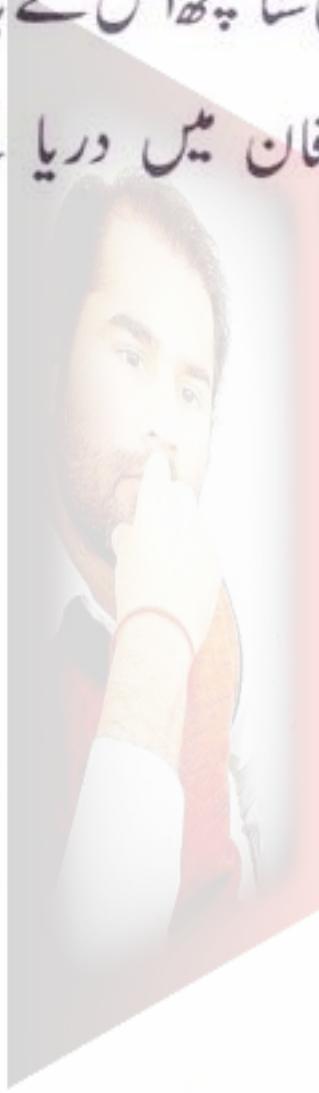
ساعتِ امکاں

عجب ہے رنگِ چمن، جا بجا اُداسی ہے
مہک اداس ہے، بادِ صبا اُداسی ہے

نہیں نہیں، یہ بھلا کس نے کہہ دیا تم سے
میں ٹھیک ٹھاک ہوں، ہاں بس ذرا اُداسی ہے

میں مبتلا کبھی ہوتا نہیں اُداسی میں
میں وہ ہوں جس میں کہ خود مبتلا اُداسی ہے

طبیب نے کوئی تفصیل تو بتائی نہیں
بہت جو پوچھا تو اتنا کہا، اُداسی ہے

ساعتِ امکاں

گدازِ قلب خوشی سے بھلا کسی کو ملا
عظیم وصف ہی انسان کا اُداسی ہے

شدید درد کی رو ہے رواں رگِ جاں میں
بلا کا رنج ہے، بے انتہا اُداسی ہے

فراق میں بھی اُداسی بڑے کمال کی تھی
پس وصال تو اُس سے سوا اُداسی ہے

تمہیں ملے جو خزانے، تمہیں مبارک ہوں
مری کمائی تو یہ بے بہا اُداسی ہے

چھپا رہی ہو، مگر چھپ نہیں رہی مری جاں
جھلک رہی ہے جو زیرِ قبا اُداسی ہے

ساعتِ امکاں

مجھے مسائلِ کون و مکاں سے کیا مطلب
مرا تو سب سے بڑا مسئلہ اُداسی ہے

فلک ہے سر پہ اُداسی کی طرح پھیلا ہُوا
زمیں نہیں ہے مرے زیرِ پا، اُداسی ہے

سخن کے بھیس میں آئی ہے آج محرمِ درد
غزل کی پہنے ہوئے ہے ردا، اُداسی ہے

عجیب طرح کی حالت ہے میری بے احوال
عجیب طرح کی بے ماجرا اُداسی ہے

وہ کیفِ ہجر میں اب غالباً شریک نہیں
کئی دنوں سے بہت بے مزا اُداسی ہے

وہ کہہ رہے تھے کہ شاعر غضب کا ہے عرفانؔ
ہر ایک شعر میں کیا غم ہے، کیا اداسی ہے

ساعتِ امکاں

کاش اک ایسی شب آئے جب تُو ہو پہلو میں
سانسیں سانسوں میں مل جائیں، آنسو آنسو میں

یاد کی لَو سے آئینے کا چہرہ ہو پُر نُور
نہا رہی ہو رات کی رانی خواب کی خوشبو میں

نیند مری لے کر چلتی ہے شام ڈھلے، اور پھر
رات الجھ کے رہ جاتی ہے اُس کے گیسو میں

رہے ہمارے ہونٹوں پر اک نام کا دن بھر وِرد
شب بھر دل کی رحل پہ رکھا اک چہرہ چومیں

ساعتِ امکاں

آپ اپنی ہی ضو سے جگمگ کرنا ساری رات
دھڑک رہا ہو جیسے میرا دل اِس جگنو میں

بولتے رہنا، ہنستے رہنا، بے مقصد، بے بات
جیسے دل آ ہی جائے گا میرے قابو میں

ویسے تو اکثر ہوتا تھا ہلکا، میٹھا درد
اب تو جیسے آگ بھری ہو یاد کے چاقو میں

ایک دعا تھی جس نے بخشی حرف کو یہ تاثیر
یہ تاثیر کہاں ہوتی ہے جادو وادو میں

جب مجھ کو بھی آ جائے گا چلنا وقت کے ساتھ
آ جائے گی کچھ تبدیلی میری بھی خُو میں

ساعتِ امکاں

تم کیا سمجھو، تم کیا جانو، کون ہوں، کیا ہوں میں
وہ اقلیم الگ ہے جس میں ہیں میری دھومیں

قحطِ سماعت کے عالم میں یہی ہے اک تدبیر
خود ہی شعر کہیں اور خود ہی پڑھ پڑھ کر جھومیں

لوگ ہمیں سمجھیں تو سمجھیں بے حرف و بے صوت
ہم شامل تو ہو نہیں سکتے ہیں اس ہاہُو میں

جن کے گھر ہوتے ہیں وہ گھر جاتے ہیں عرفانؔ
آپ بھی شب بھر ایسے مت ان سڑکوں پر گھومیں

ساعتِ امکاں

راکھ کے ڈھیر پہ کیا شعلہ بیانی کرتے
ایک قصے کی بھلا کتنی کہانی کرتے

حسن اتنا تھا کہ ممکن ہی نہ تھی خودنگری
ہم کہاں تک ترے غم کی نگرانی کرتے

شعلۂ جاں کو بجھاتے یونہی قطرہ قطرہ
خود کو ہم آگ بناتے، تجھے پانی کرتے

پھول سا تجھ کو مہکتا ہُوا رکھتے شب بھر
اپنے سانسوں سے تجھے رات کی رانی کرتے

ساعتِ امکاں

ندیاں دیکھیں تو بس شرم سے پانی ہو جائیں
چشمِ خوں بستہ سے پیدا وہ روانی کرتے

سب سے کہتے کہ یہ قصہ ہے پرانا صاحب
آہ کی آنچ سے تصویر پرانی کرتے

در و دیوار بدلنے میں کہاں کی مشکل
گھر جو ہوتا تو بھلا نقل مکانی کرتے

کوئی آجاتا کبھی یونہی اگر دل کے قریب
ہم ترا ذکر پئے یاد دہانی کرتے

سچ تو یہ ہے کہ ترے ہجر کا اب رنج نہیں
کیا دکھاوے کے لیے اشک فشانی کرتے

ساعتِ امکاں

دل کو ہر لحظہ ہی دی عقل پہ ہم نے ترجیح
یارِ جانی کو کہاں دشمن جانی کرتے

شب اسی طرح بسر ہوتی ہے میری عرفانؔ
حرفِ خوش رنگ کو اندوہِ معانی کرتے

Imagitor

ساعتِ امکاں

اپنی خبر، نہ اُس کا پتہ ہے، یہ عشق ہے
جو تھا نہیں ہے، اور نہ تھا ہے، یہ عشق ہے

پہلے جو تھا، وہ صرف تمہاری تلاش تھی
لیکن جو تم سے مل کے ہُوا ہے، یہ عشق ہے

تشکیک ہے، نہ جنگ ہے مابین عقل و دل
بس یہ یقین ہے کہ خدا ہے، یہ عشق ہے

بے حد خوشی ہے، اور ہے بے انتہا سکون
اب درد ہے، نہ غم، نہ گلہ ہے، یہ عشق ہے

ساعتِ امکاں

کیا رمز جانتی ہے تجھے اصلِ عشق کی
جو تجھ میں اس بدن کے سِوا ہے، یہ عشق ہے

زیرِ قبا جو حسن ہے، وہ حسن ہے خدا
بندِ قبا جو کھول رہا ہے، یہ عشق ہے

شہرت سے تیری خوش جو بہت ہے، یہ ہے خرد
اور یہ جو تجھ میں تجھ سے خفا ہے، یہ عشق ہے

ادراک کی کمی ہے سمجھنا اِسے مرض
اِس کی دوا، نہ اس کی دعا ہے، یہ عشق ہے

شفاف و صاف، اور لطافت میں بے مثال
سارا وجود آئینہ سا ہے، یہ عشق ہے

ساعتِ امکاں

یعنی کہ کچھ بھی اُس کے سِوا سوجھتا نہیں
ہاں تو جناب، مسئلہ کیا ہے، یہ عشق ہے

جو عقل سے بدن کو ملی تھی، وہ تھی ہوس
جو روح کو جنوں سے ملا ہے، یہ عشق ہے

اِس میں نہیں ہے دخل کوئی خوف و حرص کا
اس کی جزا، نہ اِس کی سزا ہے، یہ عشق ہے

سجدے میں ہے جو محوِ دعا، وہ ہے بے دلی
یہ جو دھمال ڈال رہا ہے، یہ عشق ہے

ہوتا اگر کچھ اور، تو ہوتا انا پرست
اِس کی رضا شکستِ انا ہے، یہ عشق ہے

عرفانؔ ماننے میں تأمل تجھے ہی تھا
میں نے تو یہ ہمیشہ کہا ہے، یہ عشق ہے

ساعتِ امکاں

دیکھ مستی وجود کی میری
تا ابد دھوم مچ گئی میری

تُو توجہ اِدھر کرے، نہ کرے
کم نہ ہوگی سپردگی میری

دل مرا کب کا ہو چکا پتھر
موت تو کب کی ہو چکی میری

اب تو برباد کر چکے، یہ کہو
کیا اِسی میں تھی بہتری میری

ساعتِ امکاں

میرے خوش رنگ زخم دیکھتے ہو
یعنی پڑھتے ہو شاعری میری

اب تری گفتگو سے مجھ پہ کھُلا
کیوں طبیعت اُداس تھی میری

دل میں اب کوئی آرزو ہی نہیں
یعنی تکمیل ہو چکی میری

زندگی کا مآل اتنا ہے
زندگی سے نہیں بنی میری

چاند حسرت زدہ سا لگتا ہے
کیا وہاں تک ہے روشنی میری

ساعتِ امکاں

دھوپ ہے اُس کی میری آنگن میں
اُس کی چھت پر ہے چاندنی میری

اک مہک روز آ کے کہتی ہے
منتظر ہے کوئی گلی میری

جانے کب دل سے آنکھ تک آ کر
بہہ گئی چیز قیمتی میری

اب میں ہر بات بھول جاتا ہوں
ایسی عادت نہ تھی، کہ تھی میری

رات بھر دل میں غُل مچاتی ہے
آرزو کوئی سر پھری میری

ساعتِ امکاں

میری آنکھوں میں آ کے بیٹھ گیا
شامِ فرقت اجاڑ دی میری

پہلے سینے میں دل دھڑکتا تھا
اب دھڑکتی ہے بے دلی میری

کیا عجب وقت ہے بچھڑنے کا
دیکھ رکتی نہیں ہنسی میری

خود کو میرے سپرد کر بیٹھا
بات تک بھی نہیں سنی میری

تیرے انکار نے کمال کیا
جان میں جان آ گئی میری

ساعتِ امکاں

خوب باتیں بنا رہا تھا، مگر
بات اب تک نہیں بنی میری

میں تو پل بھر نہیں جیا عرفانؔ
عمر کس نے گزار دی میری

ساعتِ امکاں

سب پہ ظاہر ہی کہاں حالِ زبوں ہے میرا
کس قدر خستہ و خوں بستہ دروں ہے میرا

میرے اشعار کو تقریظ و وضاحت سمجھو
ورنہ دراصل سخن کن فیکوں ہے میرا

یہ جو ٹھہراؤ بظاہر ہے، اذیت ہے مری
جو تلاطم مرے اندر ہے، سکوں ہے میرا

یہ جو صحراؤں میں اڑتی ہے، یہ ہے خاک مری
اور دریاؤں میں بہتا ہے جو، خوں ہے میرا

ساعتِ امکاں

وہ جو اخفا میں ہے، وہ اصل حقیقت ہے مری
یہ جو سب کو نظر آتا ہے، فسوں ہے میرا

بیچ میں کچھ بھی نہ ہو، یعنی بدن تک بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا ارادہ ہے تو یوں ہے میرا

رازِ حق اس پہ بھی ظاہر ہے ازل سے عرفانؔ
یعنی جبریل کا ہم عصر جنوں ہے میرا

ساعتِ امکاں

خواب میں کوئی مجھ کو آس دلانے بیٹھا تھا
آنکھ کھلی تو میں اپنے ہی سرہانے بیٹھا تھا

یونہی رکا تھا دم لینے کو، تم نے کیا سمجھا
ہار نہیں مانی تھی بس ستانے بیٹھا تھا

خود بھی لہولہان ہُوا دل، مجھے بھی زخم دیے
میں بھی کیسے وحشی کو سمجھانے بیٹھا تھا

لاکھ جتن کرنے پر بھی کم ہُوا نہ دل کا بوجھ
کیسا بھاری پتھر میں سرکانے بیٹھا تھا

ساعتِ امکاں

تارے کرنوں کی رتھ پر لائے تھے اُس کی یاد
چاند بھی خوابوں کا چندن مہکانے بیٹھا تھا

نئے برس کی خوشیوں میں مشغول تھے سب، اور میں
گئے برس کی چوٹوں کو سہلانے بیٹھا تھا

وہ تو کل جھنکار سے پرکھ لیا اُس گیانی نے
میں تو پیتل کے سکے چمکانے بیٹھا تھا

دشمن جتنے آئے اُن کے خطا ہوئے سب تیر
لیکن اپنوں کا ہر تیر نشانے بیٹھا تھا

قصوں کو سچ ماننے والے، دیکھ لیا انجام
پاگل جھوٹ کی طاقت سے ٹکرانے بیٹھا تھا

ساعتِ امکاں

مت پوچھو کتنی شدّت سے یاد آئی تھی ماں
آج میں جب چٹنی سے روٹی کھانے بیٹھا تھا

عین اُسی دم ختم ہوئی تھی مہلت، جب عرفانؔ
خود کو توڑ چکا تھا اور بنانے بیٹھا تھا

ساعتِ امکاں

ایک تاریک خلا، اُس میں چمکتا ہُوا میں
یہ کہاں آ گیا ہستی سے سرکتا ہُوا میں

شعلۂ جاں سے فنا ہوتا ہوں، قطرہ قطرہ
اپنی آنکھوں سے لہو بن کے ٹپکتا ہُوا میں

آگہی نے مجھے بخشی ہے یہ نارِ خودسوز
اک جہنم کی طرح خود میں بھڑکتا ہُوا میں

منتظر ہوں کہ کوئی آ کے مکمل کر دے
چاک پر گھومتا، بل کھاتا، درکتا ہُوا میں

ساعتِ امکاں

مجمعِ اہلِ حرم نقش بدیوار اُدھر
اور اِدھر شور مچاتا ہُوا، بکتا ہُوا میں

میرے ہی دم سے ملی ساعتِ امکان اِسے
وقت کے جسم میں دل بن کے دھڑکتا ہُوا میں

بے نیازی سے مری آتے ہوئے تنگ یہ لوگ
اور لوگوں کی توجہ سے بدکتا ہُوا میں

رات کی رات نکل جاتا ہوں خود سے باہر
اپنے خوابوں کے تعاقب میں ہمکتا ہُوا میں

ایسی یکجائی کہ مٹ جائے تمیزِ من و تُو
مجھ میں کِھلتا ہُوا تُو، تجھ میں مہکتا ہُوا میں

ساعتِ امکاں

اک تو وہ حسنِ جنوں خیز ہے عالم میں شہود
اور اک حسنِ جنوں خیز کو • ہُوا میں

ایک آواز پڑی تھی کہ کوئی سائلِ ہجر
آن کی آن میں پہنچا تھا لپکتا ہُوا میں

ہے کشیدِ سخنِ خاص ودیعت مجھ کو
گھومتا پھرتا ہوں یہ عطر چھڑکتا ہُوا میں

رازِ حق فاش ہُوا مجھ پہ بھی ہوتے ہوتے
خود تک آ ہی گیا عرفاں، بھٹکتا ہُوا میں

ساعتِ امکاں

ہو کر وداع سب سے، سبک بار ہو کے رہ
جانا ہے کب خبر نہیں، تیار ہو کے رہ

یہ لمحہ بھر بھی دھیان ہٹانے کی جا نہیں
دنیا ہے تیری تاک میں، ہشیار ہو کے رہ

خطرہ شبِ وجود کو مہرِ عدم سے ہے
سب بے خبر ہیں، تُو ہی خبردار ہو کے رہ

شاید اتر ہی آئے خنک رنگ روشنی
چل آج رات خواب میں بیدار ہو کے رہ

ساعتِ امکاں

کس انگ سے وہ لمس کھُلے گا، کسے خبر
تُو بس ہمہ وجود طلب گار ہو کے رہ

تُو اب سراپا عشق ہُوا ہے، تو لے دعا
جا سر بسر اذّیت و آزار ہو کے رہ

شاید کبھی اِسی سے اٹھے پھر ترا خمیر
بنیادِ خوابِ ناز میں مسمار ہو کے رہ

کچھ دیر ہے سراب کی نظّارگی مزید
کچھ دیر اور روح کا زنگار ہو کے رہ

اب آسمانِ حرف ہُوا تا اُفق سیاہ
اب طمطراق سے تُو نمودار ہو کے رہ

ساعتِ امکاں

بس اک نگاہ دُور ہے خوابِ سپردگی
تُو لاکھ اپنے آپ میں انکار ہو کے رہ

وہ زمزمے تھے بزمِ گماں کے، سو اب کہاں
یہ مجلسِ یقیں ہے، عزادار ہو کے رہ

اندر کی اونچ نیچ کو اخفا میں رکھ میاں
احوالِ ظاہری میں تو ہموار ہو کے رہ

بے قیمتی کے رنج سے خود کو بچا کے چل
بازارِ دلبری میں خریدار ہو کے رہ

کیسے بھلا تُو بارِ مروّت اٹھائے گا
محفل ہے دوستوں کی، سو عیار ہو کے رہ

ساعتِ امکاں

فرمانروائے عقل کے حامی ہیں سب یہاں
شاہِ جنوں کا تُو بھی وفادار ہو کے رہ

تُو ہجر کی فضیلتیں خود پر دراز رکھ
خود اپنی راہ شوق میں دیوار ہو کے رہ

لوگوں پہ اپنا آپ سہولت سے وا نہ کر
عرفانؔ میری مان لے، دشوار ہو کے رہ

ساعتِ امکاں

یہ خبر ہے، مجھ میں کچھ میرے سوا موجود ہے
اب تو بس معلوم کرنا ہے کہ کیا موجود ہے

ایک میں ہوں، جس کا ہونا ہو کے بھی ثابت نہیں
ایک وہ ہے، جو نہ ہو کر جا بجا موجود ہے

ہاں خدا ہے، اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں
اس سے تم یہ مت سمجھ لینا خدا موجود ہے

حل کبھی ہوتا نہیں یہ ہست کی اقلیم میں
میں ابھی زندہ ہوں سو یہ مسئلہ موجود ہے

ساعتِ امکاں

تاب آنکھیں لا سکیں اُس حسن کی، ممکن نہیں
میں تو حیراں ہوں کہ اب تک آئینہ موجود ہے

رات کٹتی ہے مزے سے، چین سے ہوتی ہے صبح
چاندنی موجود ہے، بادِ صبا موجود ہے

روشنی سی آ رہی ہے اِس طرف چھنتی ہوئی
اور وہ حدّت بھی جو زیرِ قبا موجود ہے

ایک پل فرصت کہاں دیتے ہیں مجھ کو میرے غم
ایک کو بہلا دیا تو دوسرا موجود ہے

درد کی شدت میں بھی چلتی ہے میرے دل کے ساتھ
اک دھڑکتی روشنی جو ہر جگہ موجود ہے

ساعتِ امکاں

معتبر تو قیس کا قصہ بھی ہے اِس ضمن میں
اِس حوالے سے مرا بھی واقعہ موجود ہے

خواب میں اک زخم دیکھا تھا بدن پر جس جگہ
صبح دیکھا تو وہاں اک داغ سا موجود ہے

ایک ہی شعلے سے جلتے آ رہے ہیں یہ چراغ
میرے مجھ تک وہی اک سلسلہ موجود ہے

یوں تو ہے عرفان ہر احساس ہی محدود سا
ایک کسک سی ہے کہ جو بے انتہا موجود ہے

ساعتِ امکاں

❦

پیارے جدا ہوئے ہیں، چھوٹا ہے گھر ہمارا
کیا حال کہہ سکے گی، یہ چشمِ تر ہمارا

بس گاہ گاہ لے آ، خاکِ وطن کی خوشبو
اے بادِ صبح گاہی، یہ کام کر ہمارا

ہیں بزمِ عاشقاں میں، بے وقعتی کے موجب
سینے میں دم ہمارے، شانوں پہ سر ہمارا

ہم اور ہی جہاں کے، یعنی کہ لامکاں کے
ہے صرف اتفاقاً، آنا اِدھر ہمارا

ساعتِ امکاں

اتمام ِدل خراشی، اسلوبِ سینہ چاکی
اظہارِ کرب ناکی، بس یہ ہنر ہمارا

اک سعیٔ بے مسافت، بے رنگ و بے لطافت
مت پوچھیے کہ کیسے، گزرا سفر ہمارا

پہلے سے اور ابتر، گویا جنوں سراسر
بس یہ بتاؤ پوچھے، کوئی اگر ہمارا

دم سادھنے سے پہلے، چپ سادھ لی گئی ہے
اظہار ہو چکا ہے، امکان بھر ہمارا

ایسے نہ آس توڑو، سب کچھ خدا پہ چھوڑو
اِس مشورے سے پہلے، سمجھو تو ڈر ہمارا

ساعتِ امکاں

ایک ملال تو ہونے کا ہے، ایک نہ ہونے کا غم ہے
شہرِ وجود سے بابِ عدم تک، ایک سا ہُو کا عالم ہے

کب تک راہ تکیں گے اُس کی، کب تک اُس کو پکاریں گے
آنکھوں میں اب کتنا نم ہے، سینے میں کتنا دم ہے

اُس کے ہوتے روز ہی آ کر مجھے جگایا کرتی تھی
میری طرف اب بادِ صبا کا آنا جانا کم کم ہے

اب تعبیر نجانے کیا ہو، خواب میں اتنا دیکھا تھا
ایک جلوس چلا جاتا ہے، آگے خونیں پرچم ہے

ساعتِ امکاں

تم لوگوں کی عادت ٹھہری جھوٹ کا شربت پینے کی
میرے پیالے سے مت پینا، میرے پیالے میں سم ہے

ہاں ویسے تو حجرۂ جاں میں بے ترتیبی ٹھیک نہیں
لیکن کیا ترتیب سے رکھوں، سب کچھ درہم برہم ہے

درد کی پردہ پوشی ہے سب، کھل جائے گر غور کرو
آہوں کی تکرار ہیں سانسیں، دل کی دھڑکن ماتم ہے

خوشبو کے پہلو میں بیٹھا، رنگ سے ہم آغوش ہُوا
جب سے اُس کا قرب ملا ہے، ہر احساس مجسم ہے

اب اظہار میں کوتاہی کی، کوئی دلیل نہیں صاحب
آنکھوں کو ہے خون مہیا، دل کو درد فراہم ہے

شہرِ سخن کے ہنگامے میں، کون سنے تیری عرفانؔ
ایک تو باتیں الجھی الجھی، پھر لہجہ بھی مدھم ہے

ساعتِ امکاں

احباب کا کرم ہے کہ خود پر کھُلا ہوں میں
مجھ کو کہاں خبر تھی کہ اتنا برا ہوں میں

خود سے مجھے جو ہے وہ گلہ کس سے میں کروں
مجھ کو منائے کون کہ خود سے خفا ہوں میں

اٹھے جو اِس طرف وہ نظر ہی کہیں نہیں
اک شہرِ کم نگاہ میں کھویا ہُوا ہوں میں

تجھ سے نہیں کہوں گا تو کس سے کہوں گا یار
پہلے سمجھ تو جاؤں کہ کیا چاہتا ہوں میں

ساعتِ امکاں

کیا اور چاہتے ہیں یہ دیدہ ورانِ عصر
عادی منافقت کا تو ہو ہی گیا ہوں میں

مل جائیں گے بہت سے تجھے مصلحت پسند
مجھ سے نہ سر کھپا کہ بہت سر پھرا ہوں میں

اب آئینہ بھی پوچھ رہا ہے، تو کیا کہوں
حسرت بھری نگاہ سے کیا دیکھتا ہوں میں

باہر ہے زندگی کی ضرورت میں زندگی
اندر سے ایک عمر ہوئی مر چکا ہوں میں

رہتا ہے اک ہجوم یہاں گوش بر غزل
سنتا ہے کون درد سے جب چیختا ہوں میں

ساعتِ امکاں

ہیں حل طلب تو مسئلے کچھ اور بھی، مگر
اپنے لیے تو سب سے بڑا مسئلہ ہوں میں

میں نے ہی تجھ جمال کو تجھ پر عیاں کیا
اے حسن خود پرست ترا آئینہ ہوں میں

جب تک میں اپنے ساتھ رہا تھا، ترا نہ تھا
اب تیرے ساتھ یوں ہوں کہ خود سے جدا ہوں میں

پہلے میں بولتا تھا بہت، سوچتا تھا کم
اب سوچتا زیادہ ہوں، کم بولتا ہوں میں

عرفانؔ کیا تجھے یہ خبر ہے کہ ان دنوں
ہر دم فنا کے باب میں کیوں سوچتا ہوں میں

ساعتِ امکاں

سخن کے شوق میں توہینِ حرف کی نہیں کی
کہ ہم نے داد کی خواہش میں شاعری نہیں کی

جو خود پسند تھے اُن سے سخن کیا کم کم
جو کج کلاہ تھے اُن سے تو بات بھی نہیں کی

کبھی بھی ہم نے نہ کی کوئی بات مصلحتاً
منافقت کی حمایت، نہیں، کبھی نہیں کی

دکھائی دیتا کہاں پھر الگ سے اپنا وجود
سو ہم نے ذات کی تفہیمِ آخری نہیں کی

ساعتِ امکاں

اُسے بتایا نہیں ہے کہ میں بدن میں نہیں
جو بات سب سے ضروری ہے وہ ابھی نہیں کی

بنامِ خوش نفسی ہم تو آہ بھرتے رہے
کہ صرف رنج کیا ہم نے، زندگی نہیں کی

ہمیشہ دل کو میسّر رہی ہے دولتِ ہجر
جنوں کے رزق میں اُس نے کبھی کمی نہیں کی

بصد خلوص اٹھاتا رہا سبھی کے یہ ناز
ہمارے دل نے ہماری ہی دلبری نہیں کی

جسے وتیرہ بنائے رہی وہ چشمِ غزال
وہ بے رخی کی سہولت ہمیں بھی تھی، نہیں کی

ہے ایک عمر سے معمول روز کا عرفانؔ
دعائے ردِّ انا ہم نے آج ہی نہیں کی

ساعتِ امکاں

کس عجب ساعتِ نایاب میں آیا ہوا ہوں
تجھ سے ملنے میں ترے خواب میں آیا ہوا ہوں

پھر وہی میں ہوں، وہی ہجر کا دریائے عمیق
کوئی دم عکسِ سرِ آب میں آیا ہوا ہوں

کیسے آئینے کے مانند چمکتا ہوا میں
عشق کے شہرِ ابد تاب میں آیا ہوا ہوں

میری ہر تان ہے از روزِ ازل تا بہ ابد
ایک سُر کے لیے مضراب میں آیا ہوا ہوں

ساعتِ امکاں

ہر گزرتے ہوئے لمحے میں ٹپکتا ہوا میں
درد ہوں، وقت کے اعصاب میں آیا ہوا ہوں

کیسی گہرائی سے نکلا ہوں عدم کی عرفان
کیسے پایاب سے تالاب میں آیا ہوا ہوں

Imagitor

ساعتِ امکاں

ہمیں نہیں آتے یہ کرتب نئے زمانے والے
ہم تو سیدھے لوگ ہیں یارو، وہی پرانے والے

ان کے ہوتے کوئی کمی ہے راتوں کی رونق میں
یادیں خواب دکھانے والی، خواب سہانے والے

کہاں گئیں رنگین پتنگیں، لٹو، کانچ کے بنٹے
اب تو کھیل بھی بچوں کے ہیں، دل دہلانے والے

وہ آنچل سے خوشبو کی لپٹیں بکھراتے پیکر
وہ چلمن کی اوٹ سے چہرے چھب دکھلانے والے

ساعتِ امکاں

بام پہ جانے والے جانیں اُس محفل کی باتیں
ہم تو ٹھہرے اُس کوچے میں خاک اڑانے والے

جب گزرو گے اِن رستوں سے تپتی دھوپ میں تنہا
تمہیں بہت یاد آئیں گے ہم سائے بچھانے والے

تم تک شاید دیر سے پہنچے مرا مہذب لہجہ
پہلے ذرا خاموش تو ہوں یہ شور مچانے والے

ہم جو کہیں، سو کہنے دینا، سنجیدہ مت ہونا
ہم تو ہیں ہی شاعر، باتیں بات بنانے والے

اچھا، پہلی بار کسی کو میری فکر ہوئی ہے
میں نے بہت دیکھے ہیں تم جیسے سمجھانے والے

ساعتِ امکاں

ایسے لبالب کب بھرتا ہے ہر امید کا کاسہ
مجھ کو حسرت سے تکتے ہیں آنے جانے والے

سفا کی میں ایک سے ہیں سب، جن کے ساتھ بھی جاؤ
کعبے والے اس جانب ہیں، وہ بت خانے والے

میرے شہر میں مانگ ہے اب تو بس ان لوگوں کی ہے
کفن بنانے والے یا مردے نہلانے والے

گیت رسیلے، بول سجیلے، کہاں سنو گے اب تم
اب تو کہتا ہے عرفان بھی شعر رلانے والے

ساعتِ امکاں

چپ ہے آغاز میں، پھر شورِ اجل پڑتا ہے
اور کہیں بیچ میں امکان کا پل پڑتا ہے

ایک وحشت ہے کہ ہوتی ہے اچانک طاری
ایک غم ہے کہ یکا یک ہی اُبل پڑتا ہے

یاد کا پھول مہکتے ہی نواحِ شب میں
کوئی خوشبو سے ملاقات کو چل پڑتا ہے

حجرۂ ذات میں سناٹا ہی ایسا ہے کہ دل
دھیان میں گونجتی آہٹ پہ اچھل پڑتا ہے

ساعتِ امکاں

روک لیتا ہے ابد وقت کے اُس پار کی راہ
دوسری سمت سے جاؤں، تو ازل پڑتا ہے

ساعتوں کی یہی تکرار ہے جاری ہر دم
میری دنیا میں کوئی آج نہ کل پڑتا ہے

تابِ یک لحظہ کہاں حسن جنوں خیز کے پیش
سانس لینے سے توجہ میں خلل پڑتا ہے

مجھ میں پھیلی ہوئی تاریکی سے گھبرا کے کوئی
روشنی دیکھ کے مجھ میں سے نکل پڑتا ہے

جب بھی لگتا ہے سخن کی نہ کوئی رَو ہے نہ لَو
دفعتاً حرف کوئی خوں میں مچل پڑتا ہے

غم چھپائے نہیں چھپتا ہے کروں کیا عرفانؔ
نام لوں اُس کا تو آواز میں بل پڑتا ہے

ساعتِ امکاں

❦

کوئی ملا، تو کسی اور کی کمی ہوئی ہے
سو دل نے بے طلبی اختیار کی ہوئی ہے

جہاں سے دل کی طرف زندگی اترتی تھی
نگاہ اب بھی اُسی بام پر جمی ہوئی ہے

ہے انتظار اِسے بھی تمہاری خوشبو کا
ہوا گلی میں بہت دیر سے رکی ہوئی ہے

تم آ گئے ہو تو اب آئینہ بھی دیکھیں گے
ابھی ابھی تو نگاہوں میں روشنی ہوئی ہے

ساعتِ امکاں

ہمارا علم تو مرہونِ لوحِ دل ہے میاں
کتابِ عقل تو بس طاق پر دھری ہوئی ہے

بناؤ سائے، حرارت بدن میں جذب کرو
کہ دھوپ صحن میں کب سے یونہی پڑی ہوئی ہے

نہیں نہیں، میں بہت خوش رہا ہوں تیرے بغیر
یقین کر کہ یہ حالت ابھی ابھی ہوئی ہے

وہ گفتگو جو مری صرف اپنے آپ سے تھی
تری نگاہ کو پہنچی، تو شاعری ہوئی ہے

ساعتِ امکاں

غموں میں کچھ کمی، یا کچھ اضافہ کر رہے ہیں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں

جو آتا ہے نظر میں، اُس کو لے آتے ہیں دل میں
نئی ترکیب سے ہم خود کو تنہا کر رہے ہیں

نظر کرتے ہیں یوں، جیسے بچھڑنے کی گھڑی ہو
سخن کرتے ہیں ایسے جیسے گریہ کر رہے ہیں

تمہارے ہی تعلق سے تو ہم ہیں اِس بدن میں
تمہارے ہی لیے تو یہ تماشا کر رہے ہیں

ساعتِ امکاں

زوال آمادگی اب گونجتی ہے دھڑکنوں میں
سو دل سے خواہشوں کا بوجھ ہلکا کر رہے ہیں

سخن تم سے ہو یا احباب سے یا اپنے دل سے
یہی لگتا ہے ہم ہر بات بے جا کر رہے ہیں

تمہاری آرزو ہونے سے پہلے بھی تو ہم تھے
سو جیسے بن پڑے اب بھی گزارا کر رہے ہیں

ذرا پوچھے کوئی معدوم ہوتے اِن دکھوں سے
ہمیں کس کے بھروسے پر اکیلا کر رہے ہیں

ہمیں روکے ہوئے ہے پاسِ ناموسِ محبت
یہ مت سمجھو کہ ہم دنیا کی پروا کر رہے ہیں

ساعتِ امکاں

بجز سینہ خراشی کچھ نہیں آتا ہے لیکن
ذرا دیکھو تو ہم یہ کام کیسا کر رہے ہیں

ہمیں اِس کام کی مشکل کا اندازہ ہے صاحب
بڑے عرصے سے ہم بھی ترکِ دنیا کر رہے ہیں

جو ہوگی صبح تو تقسیم ہو جائیں گے پھر ہم
ڈھلی ہے شام تو خود کو اکٹھا کر رہے ہیں

جنوں سے اتنا دیرینہ تعلق توڑ دیں گے
ارے توبہ کریں عرفانؔ، یہ کیا کر رہے ہیں

ساعتِ امکاں

امکان دیکھنے کو رکا تھا میں جست کا
اعلان کر دیا گیا میری شکست کا

سائے سے اپنے قد کا لگاتا ہے تُو حساب
اندازہ ہو گیا ہے ترے ذہن پست کا

تجھ کو بدن کی حد سے نکلنا کہاں نصیب
سمجھے گا کیسے روح کو آلودہ ہست کا

تُو ہے، کہ کل کی بات کا رکھتا نہیں ہے پاس
میں ہوں کہ پاس دار ہوں عہدِ الست کا

ساعتِ امکاں

جس سے گروہِ بادہ فروشاں حسد کرے
طاری ہے مجھ پہ نشہ اُسی چشمِ مست کا

جا شہرِ کم نگاہ میں شہرت سمیٹ لے
یہ کام ہے بھی تجھ سے ہی موقع پرست کا

شاہِ جنوں کا تخت بچھا ہے بہ اہتمام
پہلو میں انتظام ہے میری نشست کا

وسعت ملی ہے ضبط کو میرے بقدرِ درد
بولو کوئی جواب ہے اِس بندوبست کا

عرفاںؔ تیری لاج بھی اللہ کے سپرد
ستّار ہے وہی تو ہر اک تنگ دست کا

ساعتِ امکاں

تیرے لہجے میں ترا جہلِ دروں بولتا ہے
بات کرنا نہیں آتی ہے تو کیوں بولتا ہے؟

پھونک دی جاتی ہے اِس طرح مرے شعر میں روح
جیسے سانسوں میں کوئی کن فیکوں بولتا ہے

سننے والوں پہ مرا حال عیاں ہو کیسے
عشق ہوتا ہے تو وحشت میں سکوں بولتا ہے

تیرا اندازِ تخاطب، ترا لہجہ، ترے لفظ
وہ جسے خوفِ خدا ہوتا ہے یوں بولتا ہے؟

ساعتِ امکاں

عقل اِس باب میں خاموش ہی رہتی ہے جناب
جب ہو موضوع حقیقت، تو جنوں بولتا ہے

گفتگو کیا ہو کہ جب گویا ہوں آنکھیں تیری
چپ سی لگ جاتی ہے جب اِن کا فسوں بولتا ہے

کوئی عرفان کو سمجھائے یہ آشفتہ مزاج
جاں کا خطرہ ہو تو پہلے سے فزوں بولتا ہے
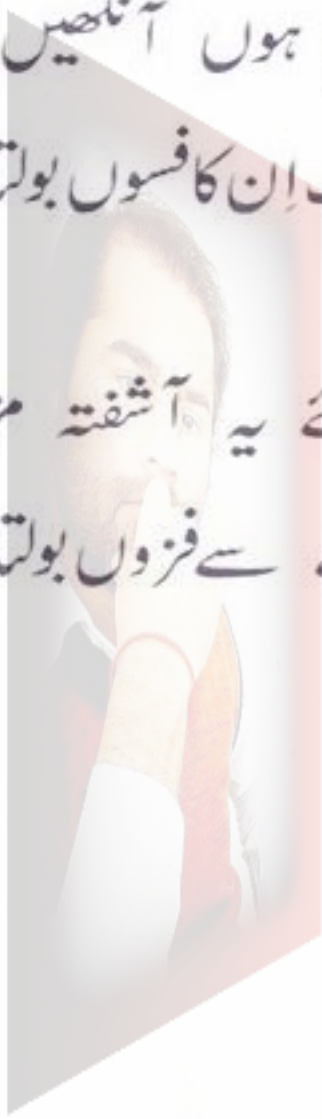
ساعتِ امکاں

اب آ بھی جاؤ، بہت دن ہوئے ملے ہوئے بھی
بھلا ہی دیں گے اگر دل میں کچھ گلے ہوئے بھی

ہماری راہ الگ ہے، ہمارے خواب جدا
ہم ان کے ساتھ نہ ہوں گے، جو قافلے ہوئے بھی

ہجومِ شہرِ خرد میں بھی ہم سے اہلِ جنوں
الگ دِکھیں گے، گریباں جو ہوں سلے ہوئے بھی

نظر کی اور مناظر کی بات اپنی جگہ
ہمارے دل کے کہاں اب، جو سلسلے ہوئے بھی

ساعتِ امکاں

یہاں ہے چاکِ قفس سے اُدھر اک اور قفس
سو ہم کو کیا، جو چمن میں ہوں گُل کھلے ہوئے بھی

ہمیں تو اپنے اصولوں کی جنگ جیتنی ہے
کسی غرض جو کوئی فتح کے صلے ہوئے بھی

ساعتِ امکاں

اُداس بس عادتاً ہوں کچھ بھی ہُوا نہیں ہے
یقین مانو کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے

اُدھیڑ کر سی رہا ہوں برسوں سے اپنی پرتیں
نتیجتاً ڈھونڈنے کو اب کچھ بچا نہیں ہے

ذرا یہ دل کی امید دیکھو، یقین دیکھو
میں ایسے معصوم سے یہ کہہ دوں، خدا نہیں ہے؟

میں اپنی مٹی سے اپنے لوگوں سے کٹ گیا ہوں
یقیناً اِس سے بڑا کوئی سانحہ نہیں ہے

ساعتِ امکاں

تو کیا کبھی مل سکیں گے، یا بات ہو سکے گی؟
نہیں نہیں جاؤ تم، کوئی مسئلہ نہیں ہے

وہ راز سینے میں رکھ کے بھیجا گیا تھا مجھ کو
وہی جو اک راز مجھ پہ اب تک کھلا نہیں ہے

میں بغض، نفرت، حسد، محبت کے ساتھ رکھوں؟
نہیں میاں میرے دل میں اتنی جگہ نہیں ہے

چہار جانب یہ بے یقینی کا گھپ اندھیرا
یہ میری وحشت کا انخلا ہے، خلا نہیں ہے

اُسی کی خوشبو سے آج تک میں مہک رہا ہوں
وہ مجھ سے بچھڑا ہوا ہے لیکن جدا نہیں ہے

ساعتِ امکاں

لکھا ہُوا ہے تمہارے چہرے پہ غم تمہارا
ہماری حالت بھی ایسی بے ماجرا نہیں ہے

یہ تازہ کاری ہے طرزِ احساس کا کرشمہ
مرے لغت میں تو لفظ کوئی نیا نہیں ہے

نیا ہُنر سیکھ فی زمانہ ہو جس کی وقعت
سخن کی نسبت سے اب کوئی پوچھتا نہیں ہے

جسے ہو عرفانِ ذات وہ کیا تری سنے گا
او ناصحا، چھوڑ دے، کوئی فائدہ نہیں ہے

ساعتِ امکاں

⁂

تمہارا نام سرِ لوحِ جاں لکھا ہُوا ہے
لکھا ہُوا ہے مری جان، ہاں لکھا ہُوا ہے

لہو سے تر ہے ورق در ورق بیاضِ سخن
حسابِ دل زدگاں سب یہاں لکھا ہُوا ہے

نشاں بتائیں تمہیں قاتلوں کے شہر کا ہم؟
فصیلِ شہر پہ شہرِ اماں لکھا ہُوا ہے

ملی ہے اہلِ جنوں کو جہاں بشارتِ اجر
وہیں تو اہلِ خرد کا زیاں لکھا ہُوا ہے

ساعتِ امکاں

زمیں بھی تنگ ہوئی، رزق بھی، طبیعت بھی
مرے نصیب میں کیا آسماں لکھا ہوا ہے؟

یہ کیسی خام امیدوں پہ جی رہے ہو میاں؟
پڑھو تو، لوحِ یقیں پر گماں لکھا ہوا ہے

تو کیا یہ ساری تباہی خدا کے حکم سے ہے؟
ذرا وہ حکم دکھاؤ، کہاں لکھا ہوا ہے؟

یہ کائنات سراسر ہے شرحِ رازِ ازل
کلامِ حق سرِ ہر کہکشاں لکھا ہوا ہے

میں سوچتا ہوں تو کیا کچھ نہیں عطائے وجود
میں دیکھتا ہوں تو بس رائگاں لکھا ہوا ہے

ساعتِ امکاں

جو چاہتا تھا میں جس وقت، وہ کبھی نہ ہُوا
کتابِ عمر میں سب ناگہاں لکھا ہُوا ہے

لکھا ہُوا نہیں کچھ بھی بنامِ خواب وجود
نبود و بود کے سب درمیاں لکھا ہُوا ہے

عدو سے کوئی شکایت نہیں ہمیں عرفانؔ
حسابِ رنج پئے دوستاں لکھا ہُوا ہے

کبھی کسی سے نہ ہم نے کوئی گلہ رکھا
ہزار زخم سہے، اور دل بڑا رکھا

چراغ یوں تو سرِ طاق دل کئی تھے، مگر
تمہاری لَو کو ہمیشہ ذرا جدا رکھا

خرد سے پوچھا، جنوں کا معاملہ کیا ہے؟
جنوں کے آگے خرد کا معاملہ رکھا

خیال روح کے آرام سے ہٹایا نہیں
جو خاک تھا سو اُسے خاک میں ملا رکھا

ساعتِ امکاں

ہزار شکر ترا، اے مرے خدائے جنوں
کہ مجھ کو راہِ خرد سے گریز پا رکھا

چھپا ہُوا نہیں تجھ سے دلِ تباہ کا حال
یہ کم نہیں کہ ترے رنج کو بچا رکھا

وہ ایک زلف کہ لپٹی رہی رگِ جاں سے
وہ اک نظر کہ ہمیں جس نے مبتلا رکھا

بس ایک آن میں گزرا میں کس تغیّر سے
کسی نے سر پہ توجہ سے ہاتھ کیا رکھا

سنائی اپنی کہانی بڑے سلیقے سے
کہیں کہیں پہ فسانے میں واقعہ رکھا

ساعتِ امکاں

سنا جو شور کہ وہ شیشہ گرکمال کا ہے
تو ہم لپک کے گئے اور قلب جا رکھا

میں جانتا تھا کہ دنیا جو ہے، وہ ہے ہی نہیں
سو خود کو خواہشِ دنیا سے ماورا رکھا

مرے جنوں نے کیے رد وجود اور عدم
الگ ہی طرح سے ہونے کا سلسلہ رکھا

خوشی سی کس نے ہمیشہ ملال میں رکھی؟
خوشی میں کس نے ہمیشہ ملال سا رکھا؟

کبھی نہ ہونے دیا طاقِ دل کو بے رونق
چراغ ایک بجھا، اور دوسرا رکھا

ساعتِ امکاں

نگاہ دار مرا تھا مرے سوا نہ کوئی
سو اپنی ذات پہ پہرا بہت کڑا رکھا

تُو پاس تھا، تو رہے محو دیکھنے میں تجھے
وصال کو بھی ترے ہجر پر اُٹھا رکھا

ترا جمال تو تجھ پر کبھی کھُلے گا نہیں
ہمارے بعد بتا آئینے میں کیا رکھا؟

ہر ایک شب تھا یہی تیرے خوش گماں کا حال
دیا بجھایا نہیں، اور در کھُلا رکھا

ہمی پہ فاش کیے رازہائے حرف و سخن
تو پھر ہمیں ہی تماشا سا کیوں بنا رکھا؟

ساعتِ امکاں

ملا تھا ایک یہی دل ہمیں بھی، آپ کو بھی
سو ہم نے عشق رکھا، آپ نے خدا رکھا

خزاں تھی، اور خزاں سی خزاں، خدا کی پناہ
ترا خیال تھا جس نے ہرا بھرا رکھا

جو ناگہاں بھی اذنِ سفر ہُوا عرفاںؔ
تو فکر کیسی کہ سامان ہے بندھا رکھا

ساعتِ امکاں

تیری نسبت سے زمانے پہ عیاں تھے ہم بھی
تُو جو موجود نہ ہوتا، تو کہاں تھے ہم بھی

حرمتِ حرف نہیں ہے سو یہ ارزانی ہے
ورنہ وہ دن بھی تھے جب خوابِ گراں تھے ہم بھی

ہم بھی حیراں ہیں بہت خود سے بچھڑ جانے پر
مستقل اپنی ہی جانب نگراں تھے ہم بھی

اب کہیں کیا کہ وہ سب قصۂ پارینہ ہُوا
رونقِ محفلِ شیریں سخناں تھے ہم بھی

ساعتِ امکاں

وقت کا جبر ہی ایسا ہے کہ خاموش ہیں اب
ورنہ تردیدِ صفِ کجکلہاں تھے ہم بھی

رنج مت کر کہ تجھے ضبط کا یارانہ رہا
کس قدر واقفِ آدابِ فغاں تھے ہم بھی

تُو بھی کردار کہانی سے الگ تھا کوئی
اپنے قصے میں حدیثِ دگراں تھے ہم بھی

کیسی حیرت جو کہیں ذکر بھی باقی نہ رہا
تُو بھی تحریر نہ تھا، حرفِ بیاں تھے ہم بھی

ہم کہ رکھتے تھے یقیں اپنی حقیقت سے سِوا
اب گماں کرنے لگے ہیں کہ گماں تھے ہم بھی

ساعتِ امکاں

رائگاں ہوتا رہا تُو بھی پئے کم نظراں
ناشناسوں کے سبب اپنا زیاں تھے ہم بھی

تُو بھی کس کس کے لیے گوش برآواز رہا
ہم کو سنتا تو کبھی، نغمۂ جاں تھے ہم بھی

ہم نہیں ہیں، تو یہاں کس نے یہ محسوس کیا؟
ہم یہاں تھے بھی تو ایسے، کہ یہاں تھے ہم بھی

ساعتِ امکاں

بام پر جمع ہوا، ابر، ستارے ہوئے ہیں
یعنی وہ سب جو ترا ہجر گزارے ہوئے ہیں

زندگی، ہم سے ہی روشن ہے یہ آئینہ ترا
ہم جو مشاطۂ وحشت کے سنوارے ہوئے ہیں

حوصلہ دینے جو آتے ہیں بتائیں انہیں کیا
ہم تو ہمت ہی نہیں خواب بھی ہارے ہوئے ہیں

شوقِ واماندہ کو درکار تھی کوئی تو پناہ
سو تمہیں خلق کیا اور تمہارے ہوئے ہیں

ساعتِ امکاں

خود شناسی کے، محبت کے، کمالِ فن کے
سارے امکان اُسی رنج پہ وارے ہوئے ہیں

روزنِ چشم تک آ پہنچا ہے اب شعلۂ دل
اشک پلکوں سے چھلکتے ہی شرارے ہوئے ہیں

ڈر کے رہ جاتے ہیں کوتاہئ اظہار سے چپ
ہم جو یک رنگئ احساس کے مارے ہوئے ہیں

ہم کہاں ہیں، سرِ دیوارِ عدم نقش وجود
اُن نگاہوں کی توجہ نے ابھارے ہوئے ہیں

بڑھ کے آغوش میں بھر لے ہمیں اے روحِ وصال
آج ہم پیرہنِ خاک اتارے ہوئے ہیں

ساعتِ امکاں

ہر ایک شکل میں صورت نئی ملال کی ہے
ہمارے چاروں طرف روشنی ملال کی ہے

ہم اپنے ہجر میں تیرا وصال دیکھتے ہیں
یہی خوشی کی ہے ساعت، یہی ملال کی ہے

ہمارے خانۂ دل میں نہیں ہے کیا کیا کچھ
یہ اور بات کہ ہر شے اُسی ملال کی ہے

ابھی سے شوق کی آزردگی کا رنج نہ کر
کہ دل کو تاب خوشی کی نہ تھی، ملال کی ہے

ساعتِ امکاں

کسی کا رنج ہو، اپنا سمجھنے لگتے ہیں
وبالِ جاں یہ کشادہ دلی ملال کی ہے

نہیں ہے خواہشِ آسودگیٔ وصل ہمیں
جوازِ عشق تو بس تشنگی ملال کی ہے

گزشتہ رات کئی بار دل نے ہم سے کہا
کہ ہو نہ ہو، یہ گھٹن آخری ملال کی ہے

رگوں میں چیختا پھرتا ہے ایک سیلِ جنوں
اگرچہ لہجے میں شائستگی ملال کی ہے

عجیب ہوتا ہے احساس کا تلوّن بھی
ابھی خوشی کی خوشی تھی، ابھی ملال کی ہے

ساعتِ امکاں

یہ کس امید پہ چلنے لگی ہے بادِ مراد؟
خبر نہیں ہے اِسے، یہ گھڑی ملال کی ہے

دعا کرو کہ رہے درمیاں یہ بے سخنی
کہ گفتگو میں تو بے پردگی ملال کی ہے

تری غزل میں عجب کیف ہے، مگر عرفانؔ
درونِ رمز و کنایہ کمی ملال کی ہے
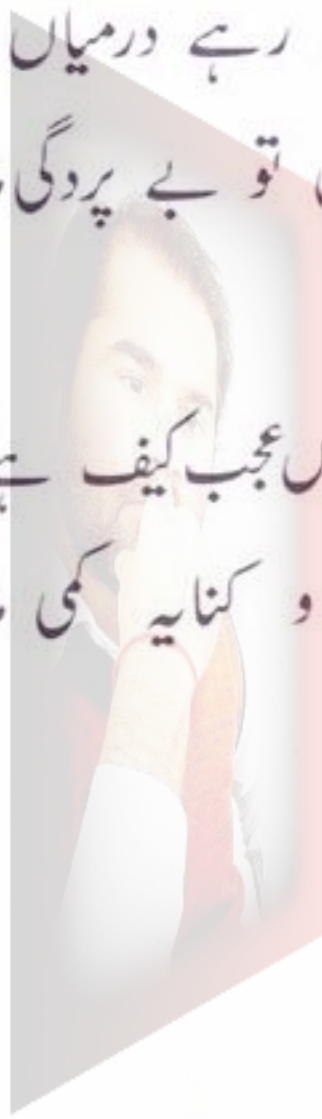
ساعتِ امکاں

بزعمِ عقل یہ کیسا گناہ میں نے کیا
اک آئینہ تھا، اُسی کو سیاہ میں نے کیا

یہ شہر کم نظراں، یہ دیارِ بے ہنراں
کسے یہ اپنے ہنر کا گواہ میں نے کیا

حریمِ دل کو جلانے لگا تھا ایک خیال
سو گُل اُسے بھی بیک سرد آہ میں نے کیا

وہی یقین رہا ہے جوازِ ہم سفری
جو گاہ اُس نے کیا، اور گاہ میں نے کیا

ساعتِ امکاں

بس ایک دل ہی تو ہے واقفِ رموزِ حیات
سو شہرِ جاں کا اسے سربراہ میں نے کیا

ہر ایک رنج اُسی باب میں کیا ہے رقم
ذرا سا غم تھا جسے بے پناہ میں نے کیا

یہ راہِ عشق بہت سہل ہوگئی جب سے
حصارِ ذات کو پیوندِ راہ میں نے کیا

یہ عمر کی ہے بسر کچھ عجب توازن سے
ترا ہُوا نہ ہی خود سے نباہ میں نے کیا

خرد نے دل سے کہا، تُو جنوں صفت ہی سہی
نہ پوچھ اُس کی کہ جس کو تباہ میں نے کیا

ساعتِ امکاں

❦

ترے جمال سے ہم رُونما نہیں ہوئے ہیں
چمک رہے ہیں، مگر آئینہ نہیں ہوئے ہیں

دھڑک رہا ہے، تو اک اسم کی ہے یہ برکت
وگرنہ واقعے اس دل میں کیا نہیں ہوئے ہیں

بتا نہ پائیں، تو خود تم سمجھ ہی جاؤ کہ ہم
بلا جواز تو بے ماجرا نہیں ہوئے ہیں

ترا کمال، کہ آنکھوں میں کچھ، زبان پہ کچھ
ہمیں تو معجزے ایسے عطا نہیں ہوئے ہیں

ساعتِ امکاں

یہ مت سمجھ کہ کوئی تجھ سے منحرف ہی نہیں
ابھی ہم اہلِ جنوں لب کشا نہیں ہوئے ہیں

بنامِ ذوقِ سخن خود نمائی آپ کریں
ہم اس مرض میں ابھی مبتلا نہیں ہوئے ہیں

ہمی وہ، جن کا سفر ماورائے وقت و وجود
ہمی وہ، خود سے کبھی جو رہا نہیں ہوئے ہیں

خود آگہی بھی کھڑی مانگتی ہے اپنا حساب
جنوں کے قرض بھی اب تک ادا نہیں ہوئے ہیں

کسی نے دل جو دُکھایا کبھی، تو ہم عرفانؔ
اُداس ہو گئے، لیکن خفا نہیں ہوئے ہیں

ساعتِ امکاں

کبھی یہ پوچھتے رہتے ہیں کیا گُم ہو گیا ہے؟
بتا دوں، مجھ سے خود اپنا پتہ گُم ہو گیا ہے

تمہارے دن میں اک رُوداد تھی جو کھو گئی ہے
ہماری رات میں اک خواب تھا، گُم ہو گیا ہے

وہ جس کے پیچ و خم میں داستاں لپٹی ہوئی تھی
کہانی میں کہیں وہ ماجرا گُم ہو گیا ہے

ذرا اہلِ جنوں آؤ، ہمیں رستہ سجھاؤ
یہاں ہم عقل والوں کا خدا گُم ہو گیا ہے

ساعتِ امکاں

نظر باقی ہے لیکن تابِ نظّارہ نہیں اب
سخن باقی ہے لیکن مدّعا گُم ہوگیا ہے

مجھے دکھ ہے، کہ زخم و رنج کے اِس جمگھٹے میں
تمہارا اور میرا واقعہ گُم ہوگیا ہے

یہ شدّت درد کی اُس کے نہ ہونے سے نہ ہوتی
یقیناً اور کچھ اُس کے سِوا گُم ہوگیا ہے

وہ جس کو کھینچنے سے ذات کی پرتیں کُھلیں گی
ہماری زندگی کا وہ سِرا گُم ہوگیا ہے

وہ در وا ہو نہ ہو، آزاد و خود بیں ہم کہاں کے
پلٹ آئیں تو سمجھو راستہ گُم ہوگیا ہے

ساعتِ امکاں

نہیں ہے جو، وہی موجود و بے کراں ہے یہاں
عجب یقیں پسِ پردۂ گماں ہے یہاں

نہ ہو اداس، زمیں شق نہیں ہوئی ہے ابھی
خوشی سے جھوم، ابھی سر پہ آسماں ہے یہاں

یہاں سخن جو فسانہ طراز ہو، وہ کرے
جو بات سچ ہے وہ ناقابلِ بیاں ہے یہاں

نہ رنج کر، کہ یہاں رفتنی ہیں سارے ملال
نہ کر ملال، کہ ہر رنج رائگاں ہے یہاں

ساعتِ امکاں

زمیں پلٹ تو نہیں دی گئی ہے محور پر؟
نمو پذیر فقط عہدِ رفتگاں ہے یہاں

یہ کارزارِ نفس ہے، یہاں دوام کسے؟
یہ زندگی ہے مری جاں، کسے اماں ہے یہاں

ہم اور وصل کی ساعت کا انتظار کریں؟
مگر یہ جسم کی دیوار درمیاں ہے یہاں

چلے جو یوں ہی ابد تک، تو اس میں حیرت کیا؟
ازل سے جب یہی بے ربط داستاں ہے یہاں

جو ہے وجود میں، اُس کو گماں کی نذر نہ کر
یہ مان لے کہ حقیقت ہی جسم و جاں ہے یہاں

کہا گیا ہے جو وہ مان لو بلا تحقیق
کہ اشتباہ کی قیمت تو نقدِ جاں ہے یہاں

ساعتِ امکاں

❋

شگفتگی سے گئے، دل گرفتگی سے گئے
ہم آج خلوتِ جاں میں بھی بے دلی سے گئے

گلہ کریں بھی تو کس سے وہ نامرادِ جنوں
جو خود زوال کی جانب بڑی خوشی سے گئے

سنا ہے، اہلِ خرد کا ہے دورِ آئندہ
یہ بات ہے تو سمجھ لو کہ ہم ابھی سے گئے

خدا کرے نہ کبھی مل سکے دوامِ وصال
جیئیں گے خاک اگر تیرے خواب ہی سے گئے

ساعتِ امکاں

ہے یہ بھی خوف ہمیں، بے توجہی سے ہوا
کہ جس نظر سے توقع ہے گر اُسی سے گئے؟

مقام کس کا کہاں ہے، بلند کس سے ہے کون
میاں یہ فکر کرو گے، تو شاعری سے گئے

ہر ایک در پہ جبیں ٹیکتے یہ سجدہ گزار
خدا کی کھوج میں نکلے تھے اور خودی سے گئے

سمجھتے کیوں نہیں یہ شاعرِ کرخت نوا
سخن کہاں کا جو لہجے کی دل کشی سے گئے

گلی تھی صحن کا حصہ ہمارے بچپن میں
مکاں بڑے ہوئے لیکن کشادگی سے گئے

ساعتِ امکاں

یہ تیز روشنی راتوں کا حسن کھا گئی ہے
تمہارے شہر میں ہم اپنی چاندنی سے گئے

برائے اہلِ جہاں لاکھ کج کلاہ تھے ہم
گئے حریمِ سخن میں تو عاجزی سے گئے

نہ پوچھیے کہ وہ کس کرب سے گزرتے ہیں
جو آگہی کے سبب عیشِ بندگی سے گئے

فقیہِ شہر کی ہر بات مان لو چپ چاپ
اگر سوال اٹھایا، تو زندگی سے گئے

اُٹھاؤ رختِ سفر، آؤ، اب چلو عرفانؔ
حسیں یہاں کے تو سب خوئے دل بری سے گئے

ساعتِ امکاں

یوں ہی اک دن خاموشی سے ڈھہ جاؤں گا
مٹی تھا، سو مٹی ہو کر رہ جاؤں گا

ایسی وحشت، ایسا غم، ایسی بے زاری
میں تو سمجھا تھا میں سب کچھ سہہ جاؤں گا

اس اُمید پہ مرتا ہوں میں لمحہ لمحہ
شاید کوئی زندہ شعر ہی کہہ جاؤں گا

یہ تکرارِ ساعت کچھ دن کی ہے پھر میں
وقت کنارے کے اُس جانب بہہ جاؤں گا

میں عرفاں کی کھوج میں ہوں، ٹھہروں گا کب تک
تیرے پہلو میں بس کچھ دن رہ جاؤں گا

ساعتِ امکاں

کیا بتاؤں کہ جو ہنگامہ بپا ہے مجھ میں
اِن دنوں کوئی بہت سخت خفا ہے مجھ میں

اُس کی خوشبو کہیں اطراف میں پھیلی ہوئی ہے
صبح سے رقص کناں بادِ صبا ہے مجھ میں

تیری صورت میں تجھے ڈھونڈ رہا ہوں میں بھی
غالبًا تُو بھی مجھے ڈھونڈ رہا ہے مجھ میں

ایک ہی سمت ہر اک خواب چلا جاتا ہے
یاد ہے یا کوئی نقشِ کفِ پا ہے مجھ میں

ساعتِ امکاں

میری بے راہ روی اِس لیے سرشار سی ہے
میرے حق میں کوئی مصروفِ دعا ہے مجھ میں

اپنے سانسوں کی کثافت سے گماں ہوتا ہے
کوئی امکان ابھی خاک ہُوا ہے مجھ میں

اک چبھن ہے کہ جو بے چین کیے رہتی ہے
ایسا لگتا ہے کہ کچھ ٹوٹ گیا ہے مجھ میں

یا تو میں خود ہی رہائی کے لیے ہوں بے تاب
یا گرفتار کوئی میرے سوا ہے مجھ میں

آئینہ اِس کی گواہی نہیں دیتا، تو نہ دے
وہ یہ کہتا ہے کوئی خاص ادا ہے مجھ میں

ساعتِ امکاں

ہوگئی دل سے تری یاد بھی رخصت شاید
آہ و زاری کا ابھی شور اٹھا ہے مجھ میں

مجھ میں آباد ہیں اک ساتھ عدم اور وجود
ہست سے برسرِ پیکار فنا ہے مجھ میں

مجلس شامِ غریباں ہے بپا چار پہر
مستقل بس یہی ماحول عزا ہے مجھ میں

خوں بہاتا ہُوا، زنجیر زنی کرتا ہُوا
کوئی پاگل ہے جو بے حال ہُوا ہے مجھ میں

شق ہوئی اب جو بالآخر یہ انا کی دیوار
اپنی جانب کوئی دروازہ کھُلا ہے مجھ میں

ساعتِ امکاں

اُس کی خوشبو سے معطر ہے مرا سارا وجود
تیرے چھونے سے جو اک پھول کِھلا ہے مجھ میں

تیرے جانے سے یہاں کچھ نہیں بدلا، مثلاً
تیرا بخشا ہُوا ہر زخم ہرا ہے مجھ میں

کیسے مل جاتی ہے آوازِ اذاں سے ہر صبح
رات بھر گونجنے والی جو صدا ہے مجھ میں

کتنی صدیوں سے اُسے ڈھونڈ رہے ہو بے سُود
آؤ، اب میری طرف آؤ، خدا ہے مجھ میں

مجھ میں جنّت بھی مری، اور جہنّم بھی مرا
جاری و ساری سزا اور جزا ہے مجھ میں

روشنی ایسے دھڑکتے تو نہ دیکھی تھی کبھی
یہ جو رہ رہ کے چمکتا ہے یہ کیا ہے مجھ میں؟

ساعتِ امکاں

* * *

اک خواب نیند کا تھا سبب، جو نہیں رہا
اُس کا قلق ہے ایسا کہ میں سو نہیں رہا

وہ ہو رہا ہے جو میں نہیں چاہتا کہ ہو
اور جو میں چاہتا ہوں، وہی ہو نہیں رہا

نم دیدہ ہوں، کہ تیری خوشی میں ہوں خوش بہت
چل چھوڑ، تجھ سے کہہ جو دیا، رو نہیں رہا

یہ زخم، جس کو وقت کا مرہم بھی کچھ نہیں
یہ داغ، سیلِ گریہ جسے دھو نہیں رہا

ساعتِ امکاں

اب بھی ہے رنج، رنج بھی خاصا شدید ہے
وہ دل کو چیرتا ہُوا غم گو نہیں رہا

آباد مجھ میں تیرے سِوا اور کون ہے؟
تجھ سے بچھڑ رہا ہوں، تجھے کھو نہیں رہا

کیا بے حسی کا دور ہے لوگو، کہ اب خیال
اپنے سِوا کسی کا کسی کو نہیں رہا

ساعتِ امکاں

رگوں میں رقص کناں موجۂ طرب کیا ہے
اگر خوشی ہے تو کس بات کی، سبب کیا ہے

کہاں میں، اور کہاں رازہائے بُود و نبُود
میں صرف دیکھنے بیٹھا ہُوا ہوں، کب، کیا ہے

ہے میری اصل اگر ماورائے وقت، تو پھر
مرے لیے یہ تماشائے روز و شب کیا ہے

نجانے کیا ہے نظر کی تلاش لاموجود
نجانے دل کی تمنائے بے طلب کیا ہے

ساعتِ امکاں

یہ جستجو، یہ طلب، یہ جنوں، یہ دربدری
مآلِ عمر عدم ہے، تو پھر یہ سب کیا ہے

ہے گفتگو میں وہ پیچیدگی کہ سوچتا ہوں
خیال کیا تھا، کہا کیا ہے، زیرِ لب کیا ہے

میں جانتا ہوں جو منظر گنوائے بیٹھا ہوں
تجھے کہاں یہ خبر تیری تاب و تب کیا ہے

پسِ زیاں جو درِ دل پہ میں نے دستک دی
کسی نے چیخ کے مجھ سے کہا کہ "اب کیا ہے"

ساعتِ امکاں

جو بے رخی کا رنگ بہت تیز مجھ میں ہے
یہ یادگارِ یارِ کم آمیز مجھ میں ہے

سیراب کشتِ ذات کو رکھتی ہے سر بسر
بہتی ہوئی جو رنج کی کاریز مجھ میں ہے

کاسہ ہے ایک فکر سے مجھ میں بھرا ہوا
اور ایک پیالہ درد سے لبریز مجھ میں ہے

یہ کربِ رائگانیِ امکاں بھی ہے، مگر
تیرا بھی اک خیال دل آویز مجھ میں ہے

ساعتِ امکاں

تازہ کھلے ہوئے ہیں یہ گُل ہائے زخم رنگ
ہر آن ایک موسمِ خوں ریز مجھ میں ہے

رکھتی ہے میری طبع رواں بابِ حرف میں
یہ مستقل جو درد کی مہمیز مجھ میں ہے

اب تک ہری بھری ہے کوئی فصلِ آرزو
عرفان ایک خطۂ زرخیز مجھ میں ہے

ساعتِ امکاں

پوچھتے کیا ہو دل کی حالت کا
درد ہے، درد بھی قیامت کا

یار، نشتر تو سب کے ہاتھ میں ہے
کوئی ماہر بھی ہے جراحت کا؟

اک نظر کیا پڑی، کہ اِس دل پر
آج تک بوجھ ہے مروّت کا

دل نے کیا سوچ کر کیا آخر؟
فیصلہ عقل کی حمایت کا

ساعتِ امکاں

کوئی مجھ سے مکالمہ بھی کرے
میں بھی کردار ہوں حکایت کا

آپ سے نبھ نہیں رہی اِس کی؟
قتل کر دیجیے روایت کا

نہیں کھلتا، یہ رشتۂ باہم
گفتگو کا ہے یا وضاحت کا؟

تیری ہر بات مان لیتا ہوں
یہ بھی انداز ہے شکایت کا

دیر مت کیجیے جناب، کہ وقت
اب زیادہ نہیں عیادت کا

ساعتِ امکاں

بے سخن ساتھ کیا نباہتے ہم؟
شکریہ ہجر کی سہولت کا

کسرِ نفسی سے کام مت لیجے
بھائی یہ دور ہے رعونت کا

مسئلہ میری زندگی کا نہیں
مسئلہ ہے مری طبیعت کا

درد اشعار میں ڈھلا ہی نہیں
فائدہ کیا ہُوا ریاضت کا؟

آپ مجھ کو معاف ہی رکھیے
میں کھلاڑی نہیں سیاست کا

ساعتِ امکاں

رات بھی دن کو سوچتے گزری
کیا بنا خواب کی رعایت کا؟

رشک جس پر سلیقہ مند کریں
دیکھ احوال میری وحشت کا

صبح سے شام تک دراز ہے اب
سلسلہ رنج بے نہایت کا

وہ نہیں قابلِ معافی، مگر
کیا کروں میں بھی اپنی عادت کا

اہل آسودگی کہاں جانیں
مرتبہ درد کی فضیلت کا

ساعتِ امکاں

اُس کا دامن کہیں سے ہاتھ آئے
آنکھ پر بار ہے امانت کا

اک تماشا ہے دیکھنے والا
آئینے سے مری رقابت کا

ایک تو جبر اختیار کا ہے
اور اک جبر ہے مشیّت کا

پھیلتا جا رہا ہے ابرِ سیاہ
خود نمائی کی اِس نحوست کا

جُز تری یاد کوئی کام نہیں
کام ویسے بھی تھا یہ فرصت کا

ساعتِ امکاں

سانحہ زندگی کا سب سے شدید
واقعہ تھا بس ایک ساعت کا

ایک دھوکہ ہے زندگی عرفانؔ
مت گماں اس پہ کر حقیقت کا

ساعتِ امکاں

یونہی اپنے آپ میں مبتلا، مری ساری عمر گزر گئی
مجھے جس کا ڈر تھا وہی ہُوا، مری ساری عمر گزر گئی

کئی غم زدوں کے تھے قافلے، کئی دل بری کے تھے سلسلے
میں کسی کی سمت نہیں گیا، مری ساری عمر گزر گئی

کبھی سلتے سلتے اُدھڑ گیا، کبھی بنتے بنتے بگڑ گیا
کوئی مجھ کو شکل نہ دے سکا، مری ساری عمر گزر گئی

جو بڑی اٹھان کا شخص تھا، عجب آن بان کا شخص تھا
وہی شخص مجھ میں بکھر چکا، مری ساری عمر گزر گئی

ساعتِ امکاں

کسی ماہ وش کی نگاہ میں، کسی خانقاہ کی راہ میں
یونہی در بدر، یونہی جا بجا، مری ساری عمر گزر گئی

مرا اختیار نہیں میں تھا، میں تلاشِ نانِ جویں میں تھا
کوئی لمحہ اپنا نہیں جیا، مری ساری عمر گزر گئی

مری حرفِ غم کی سپاہ تھی، کبھی آہ تھی، کبھی واہ تھی
یہی شور مجھ میں رہا بپا، مری ساری عمر گزر گئی

کئی ناشنیدہ خیال تھے، مرے پاس کتنے سوال تھے
مگر اس سے قبل کہ پوچھتا، مری ساری عمر گزر گئی

مرا اصل عینِ شہود تھا، کہ میں خود ورائے وجود تھا
نہ خودی ملی، نہ خدا ملا، مری ساری عمر گزر گئی

ساعتِ امکاں

مرا اور ہی کوئی طور تھا، مرا ایک اپنا ہی دور تھا
مرا دور مجھ کو نہیں ملا، مری ساری عمر گزر گئی

مرے اپنے جوگ بجوگ تھے، نہ یہ شہر تھا، نہ یہ لوگ تھے
سو میں خود میں چھپ کے پڑا رہا، مری ساری عمر گزر گئی

مری کج نوشت عبارتیں، مری کم وفور عبادتیں
کوئی کام ٹھیک نہ کر سکا، مری ساری عمر گزر گئی

میں اسیرِ بادۂ عشق تھا، میں فقیرِ جادۂ عشق تھا
میں گزر چکا، میں گزر گیا، مری ساری عمر گزر گئی

ہر اک انجمن میں پڑھے گئے، مرے شعر خوب سنے گئے
مرا غم کسی نے نہیں سنا، مری ساری عمر گزر گئی

ساعتِ امکاں

میں ہوں آپ اپنا شریکِ غم، مجھے اعتراف بہ چشمِ نم
مرا حق نہ مجھ سے ہُوا ادا، مری ساری عمر گزر گئی

مری اُن صفات کا کیا بنا، مرے ممکنات کا کیا بنا
میں کہاں گیا، مرا کیا بنا، مری ساری عمر گزر گئی

مرا اختتام قریب ہے، تُو نئی غزل کا نقیب ہے
سو تری ہوئی یہ سخن سرا، مری ساری عمر گزر گئی

کہیں ہو نہ جاؤں میں رائگاں، کہیں ہو نہ جاؤں میں رائگاں
یہی خوف مجھ میں رہا سدا، مری ساری عمر گزر گئی

ساعتِ امکاں

دل میں کبھی جو شور بپا تھا، نہیں رہا
کچھ بھی تمہارے غم کے علاوہ نہیں رہا

وہ دن بھی تھے کہ میں بھی بہت خوش لباس تھا
اب کیا کہ جب وہ دیکھنے والا نہیں رہا

میری دعا ہے تجھ سے یہ دنیا وفا کرے
میرا تو تجربہ کوئی اچھا نہیں رہا

ماحول میرے گھر کا بدلتا رہا، سو اب
میرے مزاج کا تو ذرا سا نہیں رہا

ساعتِ امکاں

کہتے نہ تھے، ہمیشہ رہے گا نہ اتنا رنج
گزرے ہیں چند سال ہی، دیکھا، نہیں رہا

کیا سانحہ ہُوا ہے یہ آنکھوں کو کیا خبر
منظر نہیں رہا، کہ اجالا نہیں رہا

کیوں دل جلائیں کر کے کسی سے بھی اب سخن
جب گفتگو کا کوئی سلیقہ نہیں رہا

میں چاہتا ہوں، دل بھی حقیقت پسند ہو
سو کچھ دنوں سے میں اِسے بہلا نہیں رہا

دھندلا سا ایک نقش ہے، جیسے کہ کچھ نہ ہو
موہوم سا خیال ہے، گویا نہیں رہا

ویسے تو اب بھی خوبیاں اُس میں ہیں ان گنت
جیسا مجھے پسند تھا، ویسا نہیں رہا

عرفاںؔ دن پھریں گے ترے، یوں نہ رنج کر
کیا میری بات کا بھی بھروسہ نہیں رہا؟

ساعتِ امکاں

زمیں کسی کی نہیں، آسماں کسی کا نہیں
نہ کر ملال کہ کوئی یہاں کسی کا نہیں

بھلا یہ لفظ کہاں، اور کربِ ذات کہاں
بقدرِ رنج غزل میں بیاں کسی کا نہیں

عدم وجود میں ہے، اور وجود ہے ہی نہیں
یقیں کسی کا نہیں ہے، گماں کسی کا نہیں

ہمیں جو کہنا ہے اک دوسرے سے کہہ لیں گے
سو کام تیرے مرے درمیاں کسی کا نہیں

ساعتِ امکاں

بہت سے لوگوں کا ہے نفع میرے ہونے میں
مرے نہ ہونے میں لیکن زیاں کسی کا نہیں

مرے سوا بھی بہت لوگ جل رہے ہیں یہاں
اگرچہ ایسا چمکتا دھواں کسی کا نہیں

ہمیشہ گونجتا رہتا ہے یہ کہیں نہ کہیں
میں جانتا ہوں سخن رائگاں کسی کا نہیں

ساعتِ امکاں

جو ہو خود ایک تماشا، وہ بھلا کیا سمجھے
میری حالت تو کوئی دیکھنے والا سمجھے

مجھ میں آباد ہے اک شہر، ترے حسن کا شہر
وہ جو باہر سے مجھے دیکھے وہ تنہا سمجھے

مجھ سے ممکن یہ نہیں ہے کہ میں کھُل کر کہہ دوں
اُس کے بس میں یہ نہیں ہے کہ اشارہ سمجھے

آہ ایسی، کہ سنے کوئی تو سمجھے نغمہ
اشک ایسا، کوئی دیکھے تو ستارا سمجھے

ساعتِ امکاں

ٹھیک ہے، دشت بھی ہوں، باغ بھی ہوں، دریا بھی
جس کو جیسا نظر آؤں مجھے ویسا سمجھے

لفظ پردہ ہیں، اُسے کاش بتا دے کوئی
اُس کو سمجھائے کہ سمجھے، مرا لہجہ سمجھے

بس یہی ہے جو میسّر ہے مرے قرب کے ساتھ
جو مرے دل میں رہے وہ اِسے دنیا سمجھے

دل کسی حرفِ ملائم سے سنبھل بھی جاتا
میرے سینے میں اچھلتا ہے بگُولا، سمجھے؟

سانحہ کر کے سنایا تھا اُسے رنجِ فراق
سن کے بس اتنا کہا اُس نے کہ "اچھا؛ سمجھے!"

ساعتِ امکاں

وصل سے اِن کے نمو پاتی ہے اک کیفیت
کوئی الفاظ و معانی کا یہ رشتہ سمجھے

اتنا دشوار ہوں کیا میں، جو کسی پر نہ کھُلوں؟
کوئی تو ہو جو مجھے میرے علاوہ سمجھے

ابھی سمجھو، تو میں کیا خوب سخن تم سے کروں
بعد میرے مجھے سمجھے بھی تو پھر کیا سمجھے

تُو سمجھتا ہے اُسے، شکر بجا لا عرفاںؔ
وہ جسے دیر، نہ کعبہ، نہ کلیسا سمجھے

ساعتِ امکاں

مقابلے پہ مرے خود مرے سوا کوئی ہے؟
نبردِ ذات سے بڑھ کر بھی معرکہ کوئی ہے؟

کوئی تو ہے مجھے میرے خلاف کرتا ہُوا
سوال یہ ہے وہ میں ہوں کہ دوسرا کوئی ہے؟

تماشا ختم ہُوا تو کوئی نہ ہوگا یہاں
یہ لوگ دیکھنے والے ہیں، سوچتا کوئی ہے؟

سنا یہ ہے کہ ہے سب کے لیے کوئی نہ کوئی
تو یعنی میرے لیے بھی ہے کوئی، کیا کوئی ہے؟

ساعتِ امکاں

وہ مجھ بہار سے گزرا، تو کھِل اُٹھا کیسا؟
کوئی بتائے کہ ایسا ہرا بھرا کوئی ہے؟

طبیبِ عشق، ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کے بتا
مریض ہوں گے، مگر مجھ سا مبتلا کوئی ہے؟

کبھی کہا تو نہیں ہے کہ مجھ سا کوئی نہیں
اگر کہوں بھی تو اِس میں مبالغہ کوئی ہے؟

مرے سکوت میں شامل، مرے سخن میں شریک
حسیں بہت ہیں، مگر اِس مزاج کا کوئی ہے؟

جسے توجّہ سے وحشت ہو، دل بری سے گریز
تمام شہر میں مجھ ایسا سرپھرا کوئی ہے؟

ساعتِ امکاں

سخن بغیر کبھی ہو سکا کوئی موجود؟
کوئی امام، پیمبر، ولی، خدا، کوئی ہے؟

وہ میرا یارِ جنوں خیز کیوں کرے نہ غرور
کسی حسین کا اُس سے مقابلہ کوئی ہے؟

ترا خیال تھا کوئی مجھے بچا لے گا
یہ دیکھ ڈوب رہا ہوں میں، چل دکھا، کوئی ہے؟

یہ ہم ہی ہیں، کہ کسی کے اگر ہوئے، تو ہوئے
تمہارا کیا ہے، کوئی ہوگا، کوئی تھا، کوئی ہے

یہ دور وہ ہے کہ جس میں کسی کا کوئی نہیں
کسی کا کوئی نہیں ہے، بتا ترا کوئی ہے؟

جنوں کے ذکر پہ یاد آ گیا مجھے عرفانؔ
کہاں چلا گیا، اُس کا اتا پتا کوئی ہے؟

ساعتِ امکاں

اگر بحال ہُوا خود سے رابطہ میرا
تو میں بتاؤں گا خود کو کہ کیا بنا میرا

ہر ایک روز کہیں چھت مرے مکاں کی گری
ہر ایک روز کوئی شخص مر گیا میرا

کوئی بھی قبر نہیں جس میں میری لاش نہ ہو
کوئی گلی نہیں جس میں نہ خوں بہا میرا

میں روشنی کے سِوا کچھ بھی کر نہیں سکتا
ہے اک چراغ کی نسبت سے سلسلہ میرا

ساعتِ امکاں

میں حل نکال ہی لوں گا کسی طریقے سے
مری سمجھ میں جو آجائے مسئلہ میرا

میں ایک صبح بکھر جاؤں گا مہک بن کر
سراغ ڈھونڈتی رہ جائے گی صبا میرا

تجھے میں خود سے بھی ملواؤں گا، مگر پہلے
کسی سے جا کے پتہ پوچھ کر تو آ میرا

ساعتِ امکاں

گماں کی کھوج کا کوئی صلہ نئیں
چلو اب مان بھی جاؤ، خدا نئیں

وہ بن جانے سبھی کچھ کہہ گیا تھا
میں سب کچھ جانتا تھا، پر کہا نئیں

جدا ہونا ہی تھا، سو ہو رہے ہیں
ذرا سی بات ہے، اِس کو بڑھا نئیں

مجھے صحرا سے مت تشبیہ دینا
مری وحشت کی کوئی انتہا نئیں

ساعتِ امکاں

میں سب کچھ جانتا ہوں، دیکھتا ہوں
میں خوابیدہ تو ہوں، سویا ہُوا نئیں

نہ آتا تو نہ ہرگز ہم بلاتے
یہاں آ ہی گیا ہے اب، تو جائیں

محبت میں بدن شامل نہ ہوتا
یہ ہم بھی چاہتے تھے، پر ہُوا نئیں

مجھے دیکھو تو کیا میں واقعی ہوں
مجھے سمجھو تو کیاں میں جا بجا ئیں

ملے کیا کیا نہ چہرے دل گلی میں
میں جس کو ڈھونڈتا تھا، وہ ملا نئیں

ساعتِ امکاں

ہمیں مت ڈھونڈ، پر خواہش کیا کر
ہمیں مت یاد کر، لیکن بُھلائیں

ہماری خواہشوں میں کوئی خواہش
رہینِ بخشش بندِ قبائیں

میں ایسا ہوں، مگر ایسا نہیں ہوں
میں ویسا تھا، مگر ویسا میں تھائیں

عظیم المرتبت شاعر بہت ہیں
مگر ہاں، جون سا شاعر ہُوائیں

کہیں سبحان اللہ، جون سن کر
وہی عرفان نے اب تک کہائیں

ساعتِ امکاں

ہمارے مسئلے اب جسم و جاں کے ہو گئے ہیں
فغاں!!! کہ ہم تو سراسر زیاں کے ہو گئے ہیں

نہ ہم پہ وار ہُوئے اپنے میسّر و موجود
یقین ہم پہ نہ کر ہم گماں کے ہو گئے ہیں

خدا کی کھوج ہے، خلقِ خدا سے اِن کو گریز
زمیں کے ہو نہ سکے، آسماں کے ہو گئے ہیں

ہمیں وہاں بھی نبھانا ہے جا کے عہدِ الست
چلیں، جو قرض ادا سب یہاں کے ہو گئے ہیں؟

ساعتِ امکاں

وہ جن کے دم سے مرا کل سنورنے والا تھا
وہ ممکنات غمِ رائگاں کے ہو گئے ہیں

چلو کہ دوسری جانب کی فکر ختم ہوئی
تمام یار صفِ دشمناں کے ہو گئے ہیں

یہ جیتے جاگتے پُر ماجرا ہیں لوگ ترے
ہمیں نہ ڈھونڈ کہ ہم داستاں کے ہو گئے ہیں

ٹھہر گئے ہیں کہ جیسے سفر تمام ہُوا
کہاں کے لوگ تھے ہم سب، کہاں کے ہو گئے ہیں

کہانی سننے سے پہلے جو تھے مرے احباب
کہانی سن کے مرے رازداں کے ہو گئے ہیں

ساعتِ امکاں

یہ دیکھ کر کے موافق ہے اس کی آب و ہوا
بگولے میرے دل بے کراں کے ہو گئے ہیں

کسی بھی بات میں اِن کی نہیں ہے رائے کوئی
عجیب لوگ ہیں، سب درمیاں کے ہو گئے ہیں

طبیعتیں نہ ملیں تو کہاں کی گفت و شنید
سخن تمام نہیں اور ہاں کے ہو گئے ہیں

مجھے اماں نہ ملی اس کا غم نہیں عرفانؔ
بس اُن کا غم ہے جو مجھ بے اماں کے ہو گئے ہیں

ساعتِ امکاں

زندگی کا سفر ایک دن، وقت کے شور سے، اک پُر خواب ساعت کے بیدار ہوتے ہی بس یک بیک، ناگہاں ختم ہو جائے گا
تم کہانی کے کس باب پر، اُس کے انجام سے کتنی دوری پہ ہو اس سے قطعِ نظر، دفعتاً یہ تمہارا بیاں ختم ہو جائے گا

بند ہوتے ہی آنکھوں کے سب، واہموں وسوسوں کے وجود و عدم کے کبھی مسئلے، ہاتھ باندھے ہوئے صف بہ صف روبرو آئیں گے
سارے پوشیدہ اسرار ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، سب وہم مر جائیں گے، بدگماں بے یقینی کا سارا دھواں ختم ہو جائے گا

بے دماغوں کے اِس اہلِ کذب و ریا سے بھرے شہر میں، ہم سوالوں سے پُر، اور جوابوں سے خالی کٹورا لیے بے طلب ہو گئے
چند ہی روز باقی ہیں بس، جمع و تفریق کے ان اصولوں کے تبدیل ہوتے ہی جب، یہ ہمارا مسلسل زیاں ختم ہو جائے گا

بادشاہوں کے قصوں میں یا راہبوں کے فقیروں کے احوال میں دیکھ لو، وقت سا بے غرض، کوئی تھا، اور نہ ہے، اور نہ ہوگا کبھی
تم کہاں کس تگ و دو میں ہو وقت کو اِس سے کیا، یہ تو وہ ہے جہاں حکم آیا کہ اب ختم ہونا ہے، یہ بس وہاں ختم ہو جائے گا

تم سمجھتے ہو شاید تمہیں زندگی یہ زمیں، اس لیے دی گئی ہے، کہ تم جیسے چاہو برت لو اِسے
تم یہ شاید نہیں جانتے، اِس زمیں کو تو عادت ہے دکھ جھیلنے کی مگر جلد ہی، یہ زمیں ہو نہ ہو، آسماں ختم ہو جائے گا

عہد ۔ حاضر میں عرفان ستار روایتی شعری اساس اور عصری حسیت کی تمام تر جلوہ سامانیوں سے وجود پانے والی جدید غزل کے ایک نمائندہ ترین شاعر ہیں۔ ان کی شاعری انفس و آفاق کے تقاضے بھی پورے کرتی ہے اور اظہار و بیان کے حوالے سے ایک ایسا موضوعاتی اور معنوی منظرنامہ مرتب کرتی ہے، جس کی مثال گزشتہ دو عشروں میں متعارف ہونے والے شعرا کے ہاں مجموعی طور پر خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔ عرفان ستار کے پہلے مجموعے تکرار ساعت نے نہ صرف شعر و ادب کو نہ صرف متعجب کیا تھا، بلکہ ان سے یہ فیصلہ کروا دیا تھا کہ مستقبل میں یہی شاعری رجحان ساز کردار ادا کرے گی۔ آج اردو کے عالمی شعری منظرنامے پر عرفان ستار جس مقبولیت اور اعتبار کی منزل پر فائز ہیں وہ مجھ ایسے دعا گو کے لیے لائق فخر ہے۔ خواجہ رضی حیدر
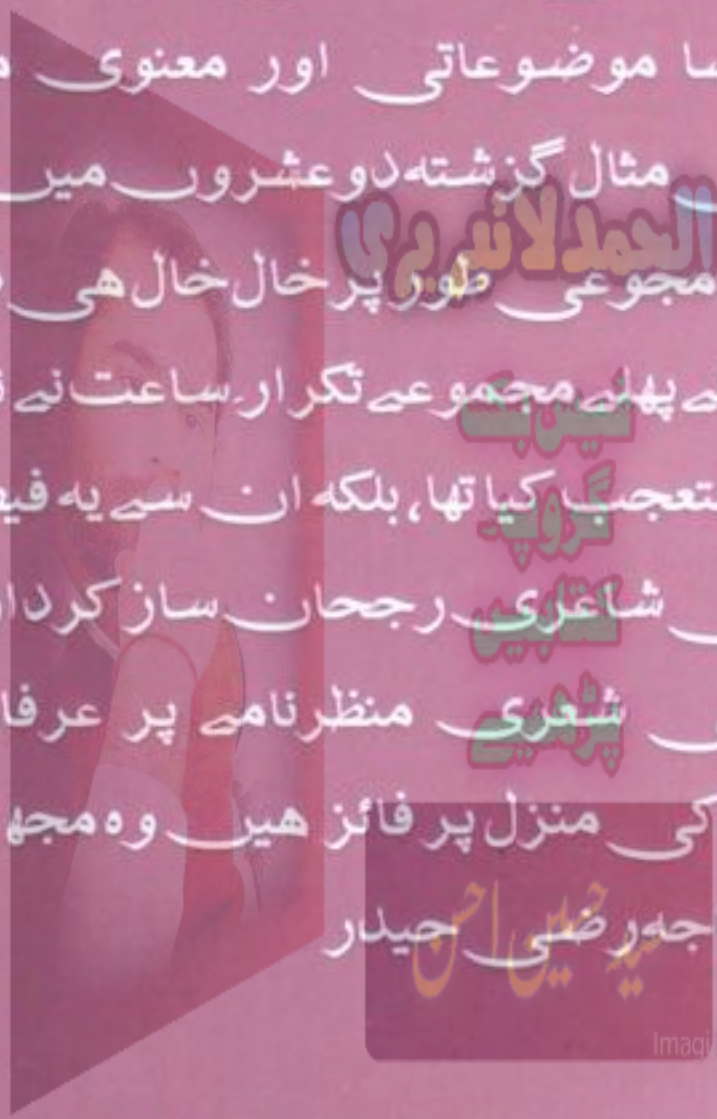
ISBN 978-81-92-8061-4-3

978-81-92-8061-4-3

DEHLEEZ
PUBLICATION

DEHLEEZ PUBLICATIONS

تکرار ساعت

عرفان ستار

تکرارِ ساعت

یہاں تکرارِ ساعت کے سوا کیا رہ گیا ہے
مسلسل ایک حالت کے سوا کیا رہ گیا ہے

کتاب کا نام : تکرارِ ساعت

شاعر : عرفان ستار

سنہ اشاعت : 2016

مطبع :

قیمت : 150/

ناشر : دہلیز پبلیکیشنز

ISBN : 978-81-928061-3-6

تکرارِ ساعت

اشاریہ

غزلیں

تکرارِ ساعت

تکرارِ ساعت

الحمد لائبریری
سنا رہے ہو ہمیں کس نگاہِ ناز کے غم
ہم اُس کے سامنے ہوتے تو پوچھتی بھی نہیں
سید حسین احسن

تکرارِ ساعت

میں

"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ میاں اس مصرعہ پر گرہ لگاؤ۔"

یہ الفاظ تھے ڈی جے سائنس کالج کے صدر شعبۂ اردو شاہد عشقی کے۔ میں اپنی غزل کالج کے سالانہ مجلے "مخزن" میں اشاعت کی غرض سے اُن کے پاس لے کر پہنچا تھا۔ جب میں اس زمین میں ایک مطلع اور دو شعر انہیں سنا چکا تو کہنے لگے۔ "بھئی بچے اِدھر اُدھر سے چیزیں لا کر دے دیتے ہیں اس لیے مجھے یہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں۔" انہوں نے غزل رکھ لی اور میں اُٹھ کر چلا آیا۔ آج بیس برس گزرنے کے بعد بھی یہی ایک مصرعہ ہے جس کے حصار سے باہر میں کوشش کے باوجود نہیں نکل پایا۔ دل ہے کہ کسی پل ٹھہرتا ہی نہیں۔ اضطراب ہے کہ ہر پل میرے وجود کو گھیرے رہتا ہے۔ ذمہ داریوں کے باب میں بظاہر چاق و چوبند نظر آنے والا 'میں' اندر سے ایک بالکل مختلف انسان ہوں، جو شاید آج پہلی بار خود سے باہر منکشف ہو رہا ہے۔ مگر یہ انکشاف بھی کتنا واضح ہو سکتا ہے جب کہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے"

بچپن ہی سے تنہائی میری مجبوری نہیں ترجیح رہی ہے۔ مطالعہ اور تفکر، یہ دو میری

تکرارِ ساعت

محبوب ترین مصروفیات ہیں۔ پڑھتے پڑھتے سوچنے لگنا اور سوچتے سوچتے کچھ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دینا دو ایسی کیفیات ہیں جن سے میری شخصیت اور شاعری کا سارا تار و پود بُنا گیا ہے۔ کسی بھی بات کو بلا جواز و تحقیق مان لینا میری سرشت میں نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں کوئی پہلا انسان نہیں جو یہ سرشت لے کر پیدا ہوا ہو۔ جو سوالات میرے ذہن میں ہیں، وہ مجھ سے پہلے بھی اُٹھائے جاتے رہے ہیں۔ مگر مجھے اس سے کیا؟ میرے لیے تو میرے سوالات یکسر اچھوتے اور نئے ہیں اور ان کے جوابات کی تلاش میں سرگرداں رہنا سراسر میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ ہر سوچنے والے انسان کے لیے یہ ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ ان سوالات کے کوئی standard جوابات نہیں ہوتے۔ کائنات کے اسرار و رموز ہر انسان پر الگ طرح سے منکشف ہوتے ہیں۔ میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ یہ سوال اتنے بڑے ہیں کہ ان کا قائم رہنا ان کے جوابات حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ یہ نہ رہیں، تو انسان اور کائنات کے درمیان تعلق محض physical نوعیت کا ہو کر رہ جائے۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے جو اس مجموعے کے قارئین کے لیے شاید کسی دلچسپی کا سامان مہیا نہ کر سکے، اس لیے اس سے گریز کر کے میں کچھ اور باتوں کی طرف آتا ہوں۔

تکرارِ ساعت

شاعری میرے نزدیک کوئی آفاقی حیثیت کا حامل ہنر ہے، نہ ہی نصف پیغمبری! میں اسے صرف فنونِ لطیفہ کی ایک خوبصورت ترین صنف اور اظہار کا ایک پُر تاثیر ذریعہ مانتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اس صنف میں الفاظ کی موجودگی اسے پیچیدہ اور گہرے افکار کی ترسیل کے لیے دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ موثر بنا دیتی ہے۔ اس نظریے کے تحت میرے نزدیک شاعری کی بنیادی ضرورت شعریت ہے، اور شعریت عبارت ہے اظہار کے حُسن سے۔ اگر کسی شعر کو پڑھ کر یا سن کر میرے احساس میں ایک خوبصورت ہیجان برپا نہیں ہوتا تو مجھے اس شعر میں بیان کردہ بڑے خیال سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک مضمون کے نیا یا پرانا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُس مضمون کا بیان کتنے شاعرانہ انداز سے ہوا ہے، یہ بات اس شعر کے اچھا یا بُرا ہونے، اور اس سے بھی قبل اُس کے شعر ہونے یا نہ ہونے کا تعین کرتی ہے۔ مجھے اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے عام طور پر نقاد اور قارئین فوری طور پر خیال تک جست لگا دیتے ہیں اور اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے کہ جس موزوں خیال کو وہ شعر سمجھ رہے ہیں اس میں شاعرانہ طرزِ اظہار ہے بھی یا نہیں؟ ولؔی اور میرؔ سے آج اجملؔ سراج تک جن شعراء کے سینکڑوں اشعار مجھے ازبر ہیں، اُن میں یہ شاعرانہ طرزِ احساس ہی مجھے ایک ایسا common factor نظر آتا ہے جو کسی شعر کو میرے حافظے اور احساس کا حصہ بناتا ہے۔

تکرارِ ساعت

میں نے شاعری کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی اور نہ ہی میں اردو زبان سے گہری واقفیت کا دعویٰ کرسکتا ہوں۔ ہاں لفظ اور تکنیک کے سلسلے میں ایک واضح conciousness کا میں دعویدار ضرور ہوں اور میرے نزدیک یہ ذہنی بیداری کسی بھی شاعر کے احساس اور اظہار کے ارتقاء میں ایک بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ میں بہت کم شعر کہتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے inspiration عام طور پر کسی تجربے سے حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ تجربہ میرے احساس کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میری شعر گوئی کم گوئی کی حدود سے باہر نہیں نکل پاتی۔

میری شاعری میرے ہونے کے جواز کی تلاشِ مسلسل کے دوران میرے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ میری شاعری میں موجود کوئی بھی کیفیت شاید نئی نہ ہو۔ اس لیے کہ اس کائنات میں کچھ بھی نیا نہیں۔ خود انسان کون سا نیا ہے؟ مگر اس انسان کا ذہن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ صلاحیت کے اعتبار سے نہیں بلکہ چیزوں کو perceive کرنے کے اعتبار سے۔ اس لیے طرزِ احساس و اظہار ہی کسی شاعر کے اپنے عہد سے وابستگی کا اعلان ہوتا ہے۔ جدیدیت کی طویل بحث کے ضمن میں مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے۔

کسی بھی شاعر کی طرح حُسن میرے احساس کا اہم ترین جزو ہے۔ مگر یہ حُسن

تکرارِ ساعت

اگر انسانی ہے تو اسے میرے احساس تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے مجھے ذہنی سطح پر متاثر کرنا لازمی ہے۔ ذہانت میرے نزدیک حسین ہونے کی بنیادی شرائط میں شامل ہے۔ کند ذہنی اور روایتی طرزِ فکر مجھ سے زیادہ دیر برداشت نہیں ہوتی اور تعلق کی سطح پر اپنے اس رویے کی وجہ سے میں اکثر مشکلات کا شکار رہتا ہوں۔ دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہوتا ہوں کہ بعض اوقات کچھ لوگ اپنے پُر خلوص طرزِ عمل کے باوجود میرے نزدیک نہیں آپاتے۔ یہ میری ایک ایسی مجبوری ہے جس کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو بالکل لاچار پاتا ہوں۔

میری خوش قسمتی کہ اس مشکل رویے کے باوجود میرے گرد ایسے لوگ ہمیشہ رہے جو میرے مزاج کی ہر کیفیت کو خوش دلی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ ان لوگوں میں سرِ فہرست میرے عزیز دوست اور خوبصورت آرٹسٹ یوسف تنویر کا نام ہے۔ ان کا دفتر میری ذہنی پناہ گاہ ہے۔ میری بیشتر غزلیں وہیں بیٹھ کر تخلیق ہوئیں اور انہوں نے میرے اولین سامع ہونے کا فرض بھی نہایت محبت کے ساتھ انجام دیا۔ میرے احباب میں مجھے شاعر تسلیم کرنے والے پہلے شخص عبدالرزاق معرفانی ہیں۔ انہوں نے اپنے احباب کی خوش ذوق نشستوں میں مجھ سے شعر سنے اور میری حوصلہ افزائی کی۔ ادبی دُنیا میں جن لوگوں نے میری رہنمائی و پذیرائی کی ان میں جونؔ ایلیا کو میں آج بھی اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔ میری شاعری کی تمام تر خامیاں میری اپنی ناکامی پر دلیل ہیں۔

تکرارِ ساعت

مگراس سے قطع نظر میرے شعری ذوق کی تشکیل میں اولاً جونؔ صاحب کی شاعری کے مطالعے، اور بعدازاں ان سے شعری مسائل پر بالمشافہ گفتگو کا بہت اہم کردار رہا۔ خواجہ رضیؔ حیدر میرے دوست ہی نہیں، میرے بڑے بھائی کی جگہ ہیں۔ شعری سفر میں وہ میرے سمت نما ہیں اور میرے نزدیک اُن کی پسندیدگی میری کسی غزل کے باقی رہنے یا تلف کر دیے جانے کا سب سے بڑا جواز ہے۔ قیصرؔ عالم کی پُر مغز گفتگو نے ہمیشہ میرے ذہن میں اکثر اٹھنے والی سوچوں کو channelize کرنے میں مدد دی جس کا شاید اُنہیں خود بھی علم نہیں، مگر جس کے لیے میں اُن کا ممنون ہوں۔ محترم نسیم درّانی، احمد ندیمؔ قاسمی، شمس الرحمٰن فاروقی، مبین مرزا، خالدؔ احمد اور آصف فرخی کا میں تہہِ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے میری غزلوں کو اپنے موقر جرائد میں شائع کر کے میرے بحیثیت شاعر تعارف میں اہم کردار ادا کیا۔ انور شعورؔ، محبؔ عارفی، نگارؔ صہبائی، رساؔ چغتائی، احمد جاویدؔ، احمد نویدؔ، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر آصف فرخی، صابر وسیمؔ، احسنؔ سلیم، لیاقت علی عاصمؔ، اجملؔ سراج، عزم بہزاد، جاذبؔ ضیائی، سعیدؔ آغا، انور جاوید ہاشمیؔ، قیصر عالم، انیق احمد، شادابؔ احسانی، معراج صاحب، میر حامد علی کانپوری (مرحوم)، سلمان علوی، قمر اللہ دتہ، احمد جمال اور محمد علی احسان کے نام ان لوگوں میں شامل ہیں جن کی رفاقت سے گزر کر میں یہ شعری مجموعہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

تکرارِ ساعت

نہیں معلوم کہ ابھی میری سوچ کو وقت کے اس بے کراں سمندر کے کتنے اُتار چڑھاؤ دیکھنا ہیں۔ کیسے کیسے تیز دھار لمحے میرے خیمہ ٔ خواب کی طنابوں کے درپے ہیں۔ اس کٹھن سفر میں ''تکرارِ ساعت'' میرے لیے کسی ایسے لمحے کا انتظار ہے جو مجھ پر مجھے ظاہر کردے، اور میرے وجود کو ایک دائمی اثبات سے ہم آہنگ کر دے۔ آیئے اور اس خاص ساعت کے انتظار میں میرے ساتھ ہو جائیں۔

عرفانؔ ستار

تکرارِ ساعت

عرفانؔ کے شعر کی اندرونی اور بیرونی ساخت

جدید زندگی اپنی گرہ میں اگر تخلیقی اعتبار سے کوئی قابلِ قدر چیز رکھتی ہے تو وہ احساس کی complexity ہے جس میں اتنی طاقت بہر حال ہے کہ ذہن کو ان حقائق سے مانوس رکھتی ہے جو اس کی حدودِ رسائی سے بالکل باہر چلے گئے ہیں۔ مجھے جدید شاعروں سے ایک مستقل شکایت یہ ہے کہ ان لوگوں کا طرزِ احساس انسانی نہیں، یعنی اس میں معنی پن غائب ہے۔ عرفانؔ ستار کے ہاں کہیں کہیں مہارت کی کمی تو نظر آتی ہے لیکن طرزِ احساس کی سطح پر وہ بعض ایسی خصوصیات رکھتے ہیں جو کسی نہایت اچھے شاعر کے لیے بھی موجبِ فخر ہو سکتی ہے۔ ان کی غزل میں محسوسات کی حسّی بناوٹ اور معنوی ساخت جس طرح یکجا ہو کر اظہار پاتی ہے، نئے غزل گو اسے تصور کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے احساس کا content تجربی سے زیادہ ذہنی ہے اور ذہنی سے زیادہ تجربی۔ یہی ان کی غزل کا بنیادی جوہر ہے۔ مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص قریب قریب ہر احساس یعنی خوشی غم وغیرہ کو کیفیت میں بھی نیا بنا دیتا ہے اور معنویت میں بھی۔ ان کے ہاں کوئی احساس متعین، ٹھوس اور سطحی نہیں ہے، اور نہ وہ کوئی طے شدہ اور یک رُخا مطلب رکھتا ہے جبکہ دوسری طرف ان کا اُسلوب بالکل وہی ہے جو policy matter پر بیان دینے والوں کا ہوتا ہے۔

تکرارِ ساعت

صاف، دوٹوک اور پتھریلا۔ان دو متضاد انتہاؤں کو اکٹھا کر لینا، ظاہر ہے خاصی تعجب انگیز بات ہے۔ٹھوس اسلوب اور سیال کیفیت اور معنویت۔ یہ ہے عرفان کے شعر کی اندرونی اور بیرونی ساخت۔

عرفان ستار بنیادی طور پر شدّتِ احساس کے شاعر ہیں۔احساس کی شدّت اگر ذہن کی شمولیت سے عاری ہو تو شعر میں کم از کم دو چیزیں داخل نہیں ہو سکتیں۔ایک لفظ کے بیشتر امکانات کو برتنے کا سلیقہ اور دوسرے تخیل۔عرفان ستار کی غزل میں یہ دونوں چیزیں تمام و کمال موجود ہیں۔

احمد جاوید

تکرارِ ساعت

یقیں سرشت شاعری

میں گزشتہ دو ماہ سے عرفان ستار کی شاعری پر گفتگو کے لیے ذہن کو راغب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر ذہن ہے کہ وہ ہنوز یکسوئی سے محروم ہے۔ عرفان ستار کا مصرعہ لکھنے کا ڈھب، خیال کی بندش، موضوعات کا تنوع، اشاراتی معنویت، محسوساتی نظام، الفاظ کا انتخاب اور پھر ان الفاظ سے ایک آہنگ کی نموداری جیسے متعدد خیالات میرے ذہن میں تشکیلی مراحل طے کرتے رہے اور میں خوش ہوتا رہا کہ جس وقت بھی قلم کاغذ لے کر بیٹھوں گا مضمون لکھ دوں گا۔ مگر اب قلم کاغذ ہاتھ میں آیا تو معلوم ہوا کہ اظہار کے حوالے سے انگلیوں میں سناٹا منجمد اور ذہن میں خیالات کم آواز ہیں۔ یہ صورتحال میرے ساتھ پہلی مرتبہ پیش آئی ہے ورنہ میری زودنویسی تو بطور طعنہ میرے احباب میں معروف رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ کیا عرفان ستار سے میری قریبی رفاقت کی بنا پر ایسا ہے اور کیا اس رفاقت نے اظہار کے لمحے میں عرفان ستار کی شاعرانہ صلاحیتوں کی کہکشاں کو میری نگاہ میں دھندلا دیا ہے؟ کیا ان کی شاعری کے بانکپن تک رسائی کے لیے دوری کی شرط قابلِ اعتنا ہے؟ میں سوالات کے ایک ہجوم میں سر نہوڑائے بیٹھا ہوا سوچ رہا ہوں کہ میں کیا لکھوں اور لکھوں بھی تو کہاں سے آغاز کروں۔

تکرارِ ساعت

گزشتہ آٹھ سال کے دوران میں نے عرفان ستار کی جو شاعری پڑھی اور سنی ہے اور جس شاعری کو میں کسی نوجوان شاعر کی موثر و تہہ دار شاعری قرار دیتا رہا ہوں کیا وہ میرے اندر اپنی کوئی توضیح نہیں رکھتی، یا پھر کیا میری اظہاری صلاحیت مجحوب ہوگئی ہے اور میں اپنی مبادیات میں معطل ہو گیا ہوں۔مگر پھر مجھے خیال آتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ادھر گزشتہ پندرہ دن کے اندر میں نے مذہبی، تاریخی اور ادبی موضوعات پر کئی مضامین لکھے ہیں اور ان مضامین کے اندازِ تحریر و مندرجات کے حوالے سے تحسین آمیز جملے بھی مجھ تک پہنچے ہیں۔بس عرفان ستار کے باب میں میرا قلم بھی خاموش ہے اور ذہن بھی۔۔۔۔۔۔میں خود سے بارہا سوال کرتا ہوں کہ کہیں میں نے عجلت میں عرفان ستار کی شاعری کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار تو نہیں کیا تھا، یا عرفان ستار سے رفاقت کی بنا پر کسی مصلحت آثار لمحے نے میری صداقت کو میرے اظہار سے بے دخل تو نہیں کر دیا تھا۔۔۔۔۔ان سوالات کے جواب میں ہر مرتبہ غزل کے کئی ثقہ اور صاحبِ طرز شعراء کے چہرے میری آنکھوں میں لو دینے لگتے ہیں۔

جون ایلیا، محبّ عارفی، احمد ہمدانی، قمر جمیل، رسا چغتائی، انور شعور، عرفان صدیقی، خالد احمد، احمد جاوید، اور اجمل سراج کے تحسین آمیز جملے میری سماعت میں گونجنے لگتے ہیں۔

تکرارِ ساعت

نگار صہبائی، ڈاکٹر اسلم فرخی ،نسیم درانی، عبداللہ جاوید، قیصر عالم، آصف فرخی، اور عتیق جیلانی کی عرفان ستار کے اشعار کی پذیرائی میں داد و تحسین مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ میں نے عرفان ستار کے شاعر ہونے کی پہلے مرحلے میں جو تصدیق کی تھی وہ گماں زاد نہیں بلکہ یقیں سرشت تھی۔ پھر ہوا یہ کہ عرفان ستار نے بھی اپنی تخلیقی ذہانت کو شعر کے حوالے سے اس قدر فروح دیا کہ بعض بے تربیت اساتذہ کی مفخر و مکلّف گردنیں اپنے ہی شانوں پر جھول گئیں۔ مجھے یاد آیا کہ جون ایلیا نے پہلی ملاقات میں جب عرفان ستار سے اپنی مخصوص ترنگ میں کہا تھا کہ ''میاں وہ شخص شاعر ہو ہی نہیں سکتا جسے جون ایلیا کے اشعار یاد نہ ہوں'' تو عرفان ستار نے ایک سانس میں ان کے تیس پینتیس شعر سنا دیے تھے اور انہوں نے جواباً کہا تھا کہ '' میاں عرفان۔ اب اگر تم اپنے شعر نہ بھی سناؤ تو ہم کہہ رہے ہیں کہ تم شاعر ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ تم نے بہترین تلفظ کے ساتھ ہمیں ہمارے وہ اشعار سنائے ہیں جو ہمیں خود بہت پسند ہیں۔''

میر و غالب اور فیض و فراق تو اپنی جگہ عرفان ستار نے ہر اُس شاعر کا مطالعہ کیا ہے جو رجحان ساز ہے یا جس میں انفرادی لب و لہجے کا کوئی امکان موجود ہے۔ یہی نہیں، عرفان نے اردو کے قدیم و جدید نثری ادب کے علاوہ مذہبیات اور مغربی ادب و فلسفے کے مطالعے سے بھی اپنی فکری توسیع کی ہے جس کی بنا پر عرفان ستار کی غزل اپنے موضوعات اور اظہار میں ایک

امتزاجی مزاج لیے ہوئے ہے۔ صنفی تقاضوں اور فنی لوازم کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے عرفاؔن نے نہ صرف موضوعات کی مخفی ندرت کو تلاش کیا بلکہ ایک پُر تاثیر محسوساتی اور اسلوبی وضع بھی اختراع کی ہے۔ اُن کا مصرعہ لکھنے کا طور عامیانہ نہیں خلاّقانہ ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں لفظ مقصود بالذّات نہیں بلکہ معنویت اور متخیلہ کی ایک بلیغ ترسیل کا وسیلہ ہیں۔ یہ ایک کُھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جدیدیت کی پیروی میں بیسوی صدی کے نصف آخر کے دوران غزل میں جو تجربات ہوئے اُن میں خیال سے زیادہ لفظ پر انحصار کیا گیا جس کی بنا پر بوجھل اور مہمل شاعری کو رواج ملا اور غزل کسی حد تک نہ صرف زود فہمی کی صلاحیت سے محروم ہوئی بلکہ قاری سے اُس کا ابلاغی رابطہ بھی مجروح ہوا۔

عرفاؔن ستار نے بیسوی صدی کے آخری عشرہ کے نصف آخر میں جب باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز کیا تو اُن سے ایک سیڑھی اوپر جو غزل لکھی جارہی تھی وہ کسی حد تک اپنی لفظیات میں بھی اور موضوعات میں بھی نہ صرف غیر شخصی تھی بلکہ الفاظ کا برتاؤ بھی غیر تخلیقی اور اتباعی تھا۔ چنانچہ عرفاؔن ستار نے اپنا قبلہ درست رکھنے کے لیے سوچتی ہوئی استفہامیہ زمینوں کے اہتمام کے ساتھ مترنم بحروں میں اپنی ہمہ جہت تخلیقی ذہانت کو بھی اس قدر صیقل کیا کہ اُن کی شاعری ایک خلاّقانہ حُسن سے ہمکنار ہوگئی۔ اسی خلاّقانہ حُسن کے سہارے وہ اپنے قاری کو انسانی احساسات

تکرارِ ساعت

کی ایک ایسی فضا میں لے جاتے ہیں جہاں شاعر کا ہر تجربہ قاری کے تجربے کا غماز ہو جاتا ہے۔ عرفان ستار کے محسوساتی نظام کی اساس محبت کی لاحاصلی پر ہے۔ لاحاصلی اپنی تاثیر میں چونکہ الم انگیز ہوتی ہے اس لیے اکثر شعرا اس الم انگیزی کو ہی اپنے تجربے کی اساس بنا لیتے ہیں۔ لیکن جن شعرا کے یہاں تخلیقی ذہانت متخیلہ سے جڑی ہوئی ہوتی ہے وہ اس الم انگیزی میں نشاط کا ایک ایسا پیوند لگا دیتے ہیں کہ یہ الم انگیزی جہاں ایک عمومی تجربہ بن کر ظاہر ہوتی ہے وہاں رسائی میں نا رسائی کا احساس شاعر کی اپنی ذات میں دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

سنا رہے ہو ہمیں کس نگاہِ ناز کے غم
ہم اُس کے سامنے ہوتے تو پوچھتی بھی نہیں

تعلق کی یہی صورت رہے گی کیا ہمیشہ
میں اب اُکتا چکا ہوں تیری اس وارفتگی سے

عجیب ہے یہ مری لاتعلقی جیسے
جو کر رہا ہوں بسر میری زندگی ہی نہ ہو

مسلسل قرب نے کیسا بدل ڈالا ہے تجھ کو
وہی لہجہ، وہی ناز و ادا ہوتے ہوئے بھی

تکرارِ ساعت

حُسن تیرا بہت جاں فزا ہی سہی، خوش نظر ہی سہی خوش ادا ہی سہی
سُن مگر دل رُبا تیرا نغمہ سرا، دیکھتا ہی نہیں سوچتا بھی تو ہے

کبھی تو چند لمحے خود سے بھی باہر بسر کر لوں
ذرا دیکھوں تو وحشت کی فراوانی کہاں تک ہے

جانے ہے کس کی اداسی مری وحشت کی شریک
مجھ کو معلوم نہیں کون یہاں تھا پہلے

بے خوابی کے سائے میں جب دو آنکھیں بے عکس ہوئیں
خاموشی نے وحشت کی تصویر اٹھا کر رقص کیا

یا مجھ سے گزاری نہ گئی عمرِ گریزاں
یا عمرِ گریزاں سے گزارا نہ گیا میں

ہجر کا عیش کہاں ہے مری قسمت میں کہ اب
زندگی رنج بہ اندازِ دگر کھینچتی ہے

تعلقات کے برزخ میں عین ممکن ہے
ذرا سا دُکھ وہ مجھے دے تو میں ترا ہو جاؤں

تکرارِ ساعت

خرد کی سادگی دیکھو کہ ظاہر حالتوں سے
مری وحشت کا اندازہ لگایا جا رہا ہے

جدید انسان چونکہ حال اور مستقبل سے جڑ کر چلتا ہے، اس لیے وہ ماضی کے کسی تجربے کو اپنا مطمعِ نظر نہیں بناتا۔ وہ کسی انتہائی تجربے اور کسی دیرپا کیفیت کی تلاش و جستجو میں رہتا ہے۔ وجود اور وجدان کی یکجائی اُس کا مسئلہ ہے۔ ایک لازوال تلاش و جستجو کی دائمی تشنگی اس کی فکر کو سیراب کرتی اور اسے حاصل سے انحراف پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ عرفانؔ ستار کی شاعری میں یہ انحراف ایک نامیاتی وحدت کے طور پر ہی موجود نہیں بلکہ ان کی تخلیقی ذہانت کا سرچشمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ایسی لفظیات، تلازمے اور استعارے جو کسی بالذات کیفیت کی نمائندگی کرتے ہیں ان کی اپنی معنویت میں قلبِ ماہیت ہوگئی ہے اور یہ اسی قلبِ ماہیت کا نتیجہ ہے کہ عرفانؔ ستار کے ہاں یکسانیت سے بے زاری کا اعلان اپنی کلیت میں ''تکرارِ ساعت'' کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔ عرفانؔ ستار تغیر اور تبدل کے محاصل سے آشنا رہتے ہوئے تغیر و تبدل کے بطون میں موجود ایک تسلسل، اور اس تسلسل میں موجود مطلق یکسانیت کے محرکات و مدرکات پر غور کرتے ہیں اور پھر ایک بے زاری سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ یہ بے زاری زندگی کے مختلف شعبوں میں مروج اور نافذ عوامل اور اصولوں سے بیک وقت ہے ورنہ ''تکرارِ ساعت'' کا اعلان بے معنی نظر آنے لگے گا۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ عرفانؔ ستار کی یہ بے زاری کسی نفسیاتی پیچیدگی

تکرارِ ساعت

یا خالصتاً شکستِ شیشۂ دل کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ جدید ترین صورتحال میں شخصی پھیلاؤ اور معدوم احساس کی بازیافت کا انعام ہے۔

ترا ہونا تو ہے بس ایک صورت کا اضافہ
ترے ہونے سے کیا تیری کمی کم ہو گئی ہے

اظہار میں جدید ہونا اور احساس میں جدید ہونا دو مختلف حالتیں ہیں، لیکن عرفانؔ ستار اپنی تخلیقی ذہانت کی بنا پر اظہار میں بھی جدید ہیں اور احساس میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رسائی سے نارسائی اور نارسائی سے رسائی کشید کرتے رہتے ہیں۔ ''تکرارِ ساعت'' کی ترکیب اگرچہ بظاہر اپنی ہیت میں طبیعات کی کوئی اصطلاح معلوم دیتی ہے مگر عرفانؔ ستار کے محسوسات میں یہ ترکیب نہ صرف مابعدالطبیعات کی نمائندہ ہوگئی ہے بلکہ عرفانؔ ستار کے سماجی اور روحانی شعور کا ایک شعری اظہار ہے۔

میرے سوا بھی کوئی گرفتار مجھ میں ہے
یا پھر مرا وجود ہی بیزار مجھ میں ہے

یہاں تکرارِ ساعت کے سوا کیا رہ گیا ہے
مسلسل ایک حالت کے سوا کیا رہ گیا ہے

تکرارِ ساعت

بہت ممکن ہے کچھ دن میں اسے ہم ترک کر دیں
تمہارا قرب عادت کے سوا کیا رہ گیا ہے

سرِ صحرائے یقیں شہرِ گماں چاہتے ہیں
ہم کسی شے کو بھی موجود کہاں چاہتے ہیں

گماں میں بھی گماں لگتی ہے اب تو زندگی میری
نظر آتا ہے اب وہ خواب میں بھی خواب سا مجھ کو

اپنا دل برباد کیا تو پھر یہ گھر آباد ہوا
پہلے میں اک عرش نشیں تھا اب پاتال میں زندہ ہوں

ڈرا رہا ہے مسلسل یہی سوال مجھے
گزار دیں گے یونہی کیا یہ ماہ و سال مجھے

زندگی کی نئی وسعتوں کا ادراک اور اپنے تخلیقی احساس میں اُن کا تجربہ جہاں کسی تخلیق کار کی محویت میں اضافہ کرتا ہے، وہاں اُس کے اندر ایسا استفہامی اضطراب پیدا کرتا ہے جو اُس کی باطنی کیفیات کو ہی زیر و زبر نہیں کرتا بلکہ اُسے ایک ایسی نوعی یکسانیت سے دوچار کر دیتا ہے کہ وہ ظاہری و باطنی تمام اشیاء اور معاملات کی طرف سے ابتدائی مرحلے پر تشکیک کا

تکرارِ ساعت

شکار ہوتا ہے اور ثانوی طور پر ان سے بے زاری کا اعلان کرنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں خود مرکزیت بھی پیدا ہوتی ہے اور خود پسندی بھی۔ جن افراد کی تخلیقی ذہانت کُند ہوتی ہے وہ اس صورتحال سے خودرحمی میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں جو بلاشبہ ایک مرض ہے۔ جیسا میں نے پہلے عرض کیا کہ عرفان ستار نے اپنی تخلیقی ذہانت کو مطالعے اور تفکر سے صیقل کیا ہے لہذا اُن کے ہاں شاعرانہ بے ساختگی و پُرکاری آ گئی ہے اور انہوں نے استفہامی اضطراب کو اپنی تخلیقی ذہانت سے اس طرح جوڑ دیا ہے کہ اُن کی شاعری میں زندگی کی آگہی اور اُس کا تصرف ایک مزاج کے طور پر نمایاں ہو گیا ہے۔

میں کہیں ہوں کہ نہیں ہوں وہ کبھی تھا کہ نہ تھا
تو ہی کہہ دے یہ سخن بے سروپا ہے کہ نہیں

میں تو وارفتگیٔ شوق میں جاتا ہوں ادھر
نہیں معلوم وہ آغوش بھی وا ہے کہ نہیں

سبھی زندہ ہیں اور سب کی طرح میں بھی ہوں زندہ
مگر جیسے کہیں سے زندگی کم ہو گئی ہے

تکرارِ ساعت

یہ بے سبب نہیں سودا خلا نوردی کا
مسافرانِ عدم رہ گزر کو دیکھتے ہیں

سُن جاناں ہم ترکِ تعلق اور کسی دن کر لیں گے
آج تجھے بھی عجلت سی ہے ہم بھی کچھ رنجیدہ ہیں

تیری ہر دلیل بہت بجا، مگر انتظار بھی تا کجا
ذرا سوچ تو مرے رازداں، میری آدھی عمر گزر گئی

میں تجھ سے ساتھ بھی تو عمر بھر کا چاہتا تھا
سو اب تجھ سے گلہ بھی عمر بھر کا ہوگیا ہے

ہمارے ساتھ جب تک درد کی دھڑکن رہے گی
ترے پہلو میں ہونے کا گماں باقی رہے گا

کھینچ رہی تھی کوئی شے، ہم کو ہر ایک سمت سے
گردشِ بے مدار میں، عمر گزار دی گئی

ہمیں بھی روز جگاتی تھی آ کے ایک مہک
چمن میں کوئی ہمارا بھی تھا صبا کر کے

تکرارِ ساعت

اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے اور میں شام سے عرفانؔ ستار کی غزلوں پر مشتمل مجموعے کے مسوّدے کو نہ صرف کئی بار پڑھ چکا ہوں بلکہ اب تو عرفانؔ ستار کے بہت سے شعر مجھے ازبر ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں عرفان ستار کے بعض ایسے اشعار جو پہلی سماعت کے دوران اپنی معنویت مجھ پر واضح نہیں کر سکے تھے اب میری تفہیمی صلاحیت پر زیرِ الفاظ مسکرا رہے ہیں اور میں کاغذ قلم سامنے رکھے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ کیا میں کوئی مضمون لکھ کر عرفانؔ ستار کی شاعری پر کسی تشریحی گفتگو کا حق ادا کر سکوں گا ؟

خواجہ رضیؔ حیدر

تکرارِ ساعت

جس دن سے اُس نگاہ کا منظر نہیں ہوں میں
ہر چند آئنہ ہوں، منور نہیں ہوں میں

بکھرا ہوا ہوں شہرِ طلب میں اِدھر اُدھر
اب تیری جستجو کو میسر نہیں ہوں میں

یہ عمر اک سراب ہے صحرائے ذات کا
موجود اس سراب میں دم بھر نہیں ہوں میں

گردش میں ہے زمین بھی، ہفت آسمان بھی
تُو مجھ پہ رکھ نظر کہ مکرر نہیں ہوں میں

تکرارِ ساعت

ہوں اُس کی بزمِ ناز میں مانندِ ذکرِ غیر
وہ بھی کبھی کبھار ہوں، اکثر نہیں ہوں میں

تُو جب طلب کرے گا مجھے بہرِ التفات
اُس دن خبر ملے گی کہ در پر نہیں ہوں میں

ہے بامِ اوج پر یہ مری تمکنت مگر
تیرے تصرفات سے باہر نہیں ہوں میں

میں ہوں ترے تصورِ تخلیق کا جواز
اپنے کسی خیال کا پیکر نہیں ہوں میں

کر دے سلوکِ جاں سے معطر مشامِ جاں
چُھو لے مجھے کہ خواب کا منظر نہیں ہوں میں

عرفانؔ خوش عقیدگی اپنی جگہ مگر
غالبؔ کی خاکِ پا کے برابر نہیں ہوں میں

تکرارِ ساعت

آج بامِ حرف پر امکان بھر میں بھی تو ہوں
میری جانب اک نظر اے دیدہ ور میں بھی تو ہوں

بے اماں سائے کا بھی رکھ بادِ وحشت کچھ خیال
دیکھ کر چل درمیانِ بام و در میں بھی تو ہوں

رات کے پچھلے پہر پُرشور سناٹوں کے بیچ
تُو اکیلی تو نہیں اے چشمِ تر میں بھی تو ہوں

تُو اگر میری طلب میں پھر رہا ہے در بہ در
اپنی خاطر ہی سہی پر در بہ در میں بھی تو ہوں

تکرارِ ساعت

تیری اس تصویر میں منظر مکمل کیوں نہیں
میں کہاں ہوں یہ بتا اے نقش گر میں بھی تو ہوں

سن اسیرِ خوش ادائی منتشر تُو ہی نہیں
میں جو خوش اطوار ہوں، زیر و زبر میں بھی تو ہوں

خود پسندی میری فطرت کا بھی وصفِ خاص ہے
بے خبر تُو ہی نہیں ہے بے خبر میں بھی تو ہوں

دیکھتی ہے جوں ہی پسپائی پہ آمادہ مجھے
روح کہتی ہے بدن سے، بے ہنر میں بھی تو ہوں

دشتِ حیرت کے سفر میں کب تجھے تنہا کیا
اے جنوں میں بھی تو ہوں اے ہم سفر میں بھی تو ہوں

کوزہ گر بے صورتی سیراب ہونے کی نہیں
اب مجھے بھی شکل دے اس چاک پر میں بھی تو ہوں

تکرارِ ساعت

یوں صدا دیتا ہے اکثر کوئی مجھ میں سے مجھے
تجھ کو خوش رکھے خدا یونہی مگر میں بھی تو ہوں

تعلق کو نبھانے کے بہت دُکھ سہہ چکے ہم
سو باقی عمر اپنے ساتھ رہنا چاہتے ہیں

تکرارِ ساعت

نصیب ہجر ہی ٹھہرا تو رسم و راہ بھی کیا
یہ اہتمامِ ملاقات گاہ گاہ بھی کیا

نہ ہو جو ذوقِ تماشا یہاں تو کچھ بھی نہیں
نظر کی بزم بھی کیا دل کی خانقاہ بھی کیا

بہت سکون ہے بیداریوں کے نرغے میں
تو مجھ کو چھوڑ گئی خواب کی سپاہ بھی کیا

سب اپنے اپنے طریقے ہیں خود نمائی کے
قبائے عجز بھی کیا فخر کی کلاہ بھی کیا

تکرارِ ساعت

یہ راہِ شوق ہے اس پر قدم یقین سے رکھ
جنوں کے باب میں اس درجہ اشتباہ بھی کیا

نہیں ہے کوئی بھی صورت سپردگی کے سوا
ہوس کی قید بھی کیا عشق کی پناہ بھی کیا

مجھے تمہاری تمہیں میری ہم نشینی کی
بس ایک طرح کی عادت سی ہے، نباہ بھی کیا

کوئی ٹھہر کے نہ دیکھے میں وہ تماشا ہوں
بس اک نگاہ رُکی تھی، سو وہ نگاہ بھی کیا

تکرارِ ساعت

خود سے غافل بہت دیر ہم رہ چکے اب ہمیں کچھ ہماری خبر چاہیے
چشمِ رمز آشنا، قلبِ عقدہ کشا، اک ذرا سی توجہ اِدھر چاہیے

مستقل دل میں موجود ہے اک چبھن، اب نہ وہ خوش دلی ہے نہ ویسا سخن
مضطرب ہے طبیعت بہت ان دنوں، کچھ علاج اس کا اے چارہ گر چاہیے

چاک عہدِ تمنا کے سب سل گئے، ہجر کے ساز سے دل کے سُر مل گئے
بس یہی ٹھیک ہے کاتبِ زندگی، عمر باقی اسی طرز پر چاہیے

ذوقِ تخلیق کی آبیاری کہاں، ہم کہاں اور یہ ذمہ داری کہاں
حسبِ توفیق محوِ سخن ہیں مگر، یہ نہیں جانتے کیا ہنر چاہیے

تکرارِ ساعت

ہر کسی کو گلہ بیش و کم ہے یہی، آدمی کا ہمیشہ سے غم ہے یہی
جو ملا اُس کی ایسی ضرورت نہ تھی، جو نہیں مل سکا وہ مگر چاہیے

رنگ و خوشبو کا سیلاب کس کام کا، ایک لمحہ تو ہے عمر کے نام کا
یہ نظارا بہ قدرِ نظر چاہیے، یہ مہک بس ہمیں سانس بھر چاہیے

نخلِ دل کی ہر اک شاخ بے جان ہے، تازگی کا مگر پھر بھی امکان ہے
زندگی کی ذرا سی رمق چاہیے، اب نفس کا یہاں سے گزر چاہیے

کام کچھ خاص ایسا یہاں پر نہیں، قرض بھی اب کوئی جسم و جاں پر نہیں
یعنی اپنی طرف واپسی کے لیے، اب ہمیں صرف اذنِ سفر چاہیے

لفظ کافی نہیں ہیں سفر کے لیے، اس دیارِ سخن میں گزر کے لیے
عاجزی چاہیے، آگہی چاہیے، دردِ دل چاہیے، چشمِ تر چاہیے

آپ کی در بہ در جبہ سائی کہاں، میرؔ کی خاکِ پا تک رسائی کہاں
آپ کو خلعتِ سیم و زر چاہیے، وہ بھی کچھ وقت سے پیشتر چاہیے

تکرارِ ساعت

وہ چراغِ جاں کہ چراغ تھا کہیں رہ گزار میں بجھ گیا
میں جو اک شعلہ نژاد تھا ہوسِ قرار میں بجھ گیا

مجھے کیا خبر تھی تری جبیں کی وہ روشنی مرے دم سے تھی
میں عجیب سادہ مزاج تھا ترے اعتبار میں بجھ گیا

مجھے رنج ہے کہ میں موسموں کی توقعات سے کم رہا
مری لَو کو جس میں اماں ملی میں اُسی بہار میں بجھ گیا

وہ جو لمس میری طلب رہا وہ جھلس گیا مری کھوج میں
سو میں اُس کی تاب نہ لا سکا کفِ داغ دار میں بجھ گیا

تکرارِ ساعت

جنہیں روشنی کا لحاظ تھا جنہیں اپنے خواب پہ ناز تھا
میں اُنہی کی صف میں جلا کِیا میں اُسی قطار میں بجھ گیا
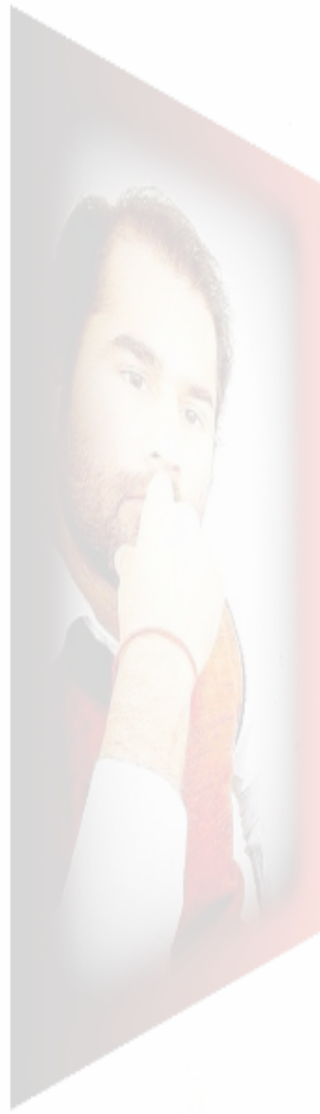
ایک ملال تو ہونے کا ہے، ایک نہ ہونے کا غم ہے
شہرِ وجود سے بابِ عدم تک، ایک سا ہُو کا عالم ہے

تکرارِ ساعت

وفا کے باب میں اپنا مثالیہ ہو جاؤں
ترے فراق سے پہلے ہی میں جدا ہو جاؤں

میں اپنے آپ کو تیرے سبب سے جانتا ہوں
ترے یقین سے ہٹ کر تو واہمہ ہو جاؤں

تعلقات کے برزخ میں عین ممکن ہے
ذرا سا دُکھ وہ مجھے دے تو میں ترا ہو جاؤں

ابھی میں خوش ہوں تو غافل نہ جان اپنے سے
نہ جانے کون سی لغزش پہ میں خفا ہو جاؤں

تکرارِ ساعت

ابھی تو راہ میں حائل ہے آرزو کی فصیل
ذرا یہ عشق سوا ہو تو جا بہ جا ہو جاؤں

ابھی تو وقت تنفس کے ساتھ چلتا ہے
ذرا ٹھہر کہ میں اس جسم سے رہا ہو جاؤں

ابھی تو میں بھی تری جستجو میں شامل ہوں
قریب ہے کہ تجسس سے ماورا ہو جاؤں

خموشیاں ہیں، اندھیرا ہے، بے یقینی ہے
رہے نہ یاد بھی تیری تو میں خلا ہو جاؤں

کسی سے مل کے بچھڑنا بڑی اذیت ہے
تو کیا میں عہدِ تمنا کا فاصلہ ہو جاؤں

ترے خیال کی صورت گری کا شوق لیے
میں خواب ہو تو گیا ہوں اب اور کیا ہو جاؤں

تکرارِ ساعت

یہ حرف وصوت کا رشتہ ہے زندگی کی دلیل
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ بے صدا ہو جاؤں

وہ جس نے مجھ کو ترے ہجر میں بحال رکھا
تُو آ گیا ہے تو کیا اُس سے بے وفا ہو جاؤں

تحیر خیز موجیں ہیں نہ پُر ہیبت تلاطم
عجب اک بے تغیر بے کرانی رہ گئی ہے

تکرارِ ساعت

ایک دنیا کی کشش ہے جو اُدھر کھینچتی ہے
اک طبیعت ہے کہ آزارِ ہنر کھینچتی ہے

ایک جانب لیے جاتی ہے قناعت مجھ کو
ایک جانب ہوسِ لقمۂ تر کھینچتی ہے

اک بصیرت ہے کہ معلوم سے آگے ہے کہیں
اک بصارت ہے کہ جو حدِ نظر کھینچتی ہے

ہجر کا عیش کہاں ہے مری قسمت میں کہ اب
زندگی رنج بہ اندازِ دگر کھینچتی ہے

تکرارِ ساعت

ایک منزل ہے جو امکان سے باہر ہے کہیں
کیا مسافت ہے کہ بس گردِ سفر کھینچتی ہے

ایک خواہش ہے جسے سمت کا ادراک نہیں
اک خلش ہے جو نہ معلوم کدھر کھینچتی ہے

اک طرف دل کا یہ اصرار کہ خلوت خلوت
اک طرف حسرتِ تسکینِ نظر کھینچتی ہے

تکرارِ ساعت

کاوشِ روزگار میں، عمر گزار دی گئی
جبر کے اختیار میں، عمر گزار دی گئی

لمحۂ تازہ پھر کوئی آنے نہیں دیا گیا
ساعتِ انتظار میں، عمر گزار دی گئی

سوزنِ چشمِ یار سے، شوق رفو گری کا تھا
جامۂ تار تار میں، عمر گزار دی گئی

بامِ خیال پر اُسے دیکھا گیا تھا ایک شب
پھر اُسی رہ گزار میں، عمر گزار دی گئی

تکرارِ ساعت

کھینچ رہی تھی کوئی شے ہم کو ہر ایک سمت سے
گردشِ بے مدار میں، عمر گزار دی گئی

رکھا گیا کسی سے یوں، ایک نفس کا فاصلہ
سایۂ مشکبار میں، عمر گزار دی گئی

زخمِ امید کا علاج، کوئی نہیں کیا گیا
پرسشِ نوکِ خار میں، عمر گزار دی گئی

دھول نظر میں رہ گئی، اُس کو وداع کر دیا
اور اُسی غبار میں، عمر گزار دی گئی

ساری حقیقتوں سے ہم، صرفِ نظر کیے رہے
خواب کے اعتبار میں، عمر گزار دی گئی

آیا نہیں خیال تک، شوق کے اختتام کا
خواہشِ بے کنار میں، عمر گزار دی گئی

تکرارِ ساعت

صحبتِ تازہ کار کی، نغمہ گری تھی رائیگاں
شورِ سکوتِ یار میں، عمر گزار دی گئی

وہ جو گیا تو ساتھ ہی، وقت بھی کالعدم ہوا
لمحۂ پُر بہار میں، عمر گزار دی گئی

تکمیل تو زوال کا پہلا پڑاؤ ہے
خود کو اسی سبب سے مکمل نہیں کیا

تکرارِ ساعت

اس طرح دیکھتا ہوں اُدھر وہ جدھر نہ ہو
جیسے دکھائی دے کوئی صورت، مگر نہ ہو

یہ شہرِ نا شناس ہے کیا اس کا اعتبار
اچھا رہے گا وہ جو یہاں معتبر نہ ہو

ایسے قدم قدم وہ سراپا غرور ہے
جیسے خرامِ ناز سے آگے سفر نہ ہو

میں آج ہوں سو مجھ کو سماعت بھی چاہیے
ممکن ہے یہ سخن کبھی بارِ دگر نہ ہو

تکرارِ ساعت

ہونے دو آج شاخِ تمنا کو بارور
ممکن ہے کل صبا کا یہاں سے گزر نہ ہو

میں بھی دکھاؤں شوق کی جولانیاں تجھے
یہ مشتِ خاک راہ میں حائل اگر نہ ہو

اک یہ فریب دیکھنا باقی ہے وقت کا
دل ڈوب جائے اور دوبارہ سحر نہ ہو

یہ کیا کہ ہم رکاب رہے خوفِ رہ گزر
کس کام کا جنوں جو قدم دشت بھر نہ ہو

تکرارِ ساعت

خوش مزاجی مجھ پہ میری بے دلی کا جبر ہے
شوقِ بزم آرائی بھی تیری کمی کا جبر ہے

کون بنتا ہے کسی کی خود ستائی کا سبب
عکس تو بس آئینے پر روشنی کا جبر ہے

خواب خواہش کا، عدم اثبات کا، غم وصل کا
زندگی میں جو بھی کچھ ہے سب کسی کا جبر ہے

اپنے رد ہونے کا ہر دم خوف رہتا ہے مجھے
یہ مری خود اعتمادی خوف ہی کا جبر ہے

تکرارِ ساعت

کارِ دنیا کے سوا کچھ بھی مرے بس میں نہیں
میری ساری کامیابی بے بسی کا جبر ہے

میں کہاں اور بے ثباتی کا یہ ہنگامہ کہاں
یہ مرا ہونا تو مجھ پر زندگی کا جبر ہے

یہ سخن یہ خوش کلامی درحقیقت ہے فریب
یہ تکلم روح کی بے رونقی کا جبر ہے

شہرِ دل کی راہ میں حائل ہیں یہ آسائشیں
یہ مری آسودگی کم ہمتی کا جبر ہے

جس کا سارا حُسن تیرے ہجر ہی کے دم سے تھا
وہ تعلق اب تری موجودگی کا جبر ہے

جبر کی طابع ہے ہر کیفیتِ عمرِ رواں
آج کا غم جس طرح کل کی خوشی کا جبر ہے

تکرارِ ساعت

کچھ نہیں کھلتا مرے شوقِ تصرف کا سبب
شوقِ سیرابی تو میری تشنگی کا جبر ہے

جو سخن امکان میں ہے وہ سخن ہے بے سخن
یہ غزل تو کچھ دنوں کی خامشی کا جبر ہے
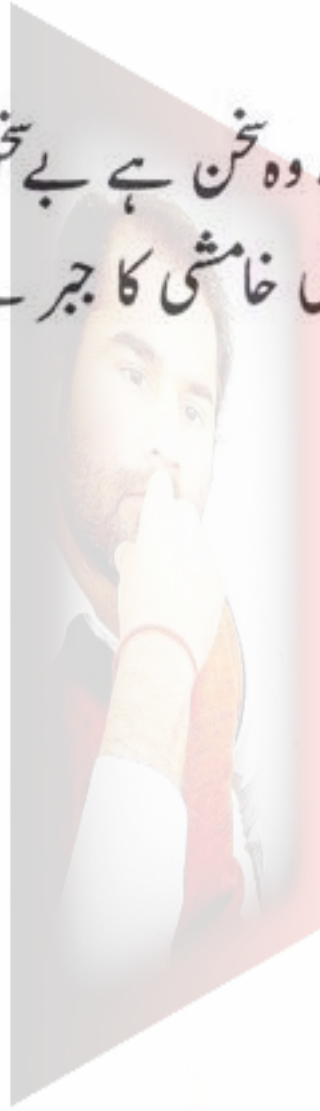
بے رنگ ترے در سے کب، خاک بسر اٹھے
یا پیراہنِ گل میں، یا خون میں تر اٹھے

تکرارِ ساعت

نگاہِ شوق سے راہِ سفر کو دیکھتے ہیں
پھر ایک رنج سے دیوار و در کو دیکھتے ہیں

نہ جانے کس کے بچھڑنے کا خوف ہے اُن کو
جو روز گھر سے نکل کر شجر کو دیکھتے ہیں

یہ روز و شب ہیں عبارت اسی توازن سے
کبھی ہنر کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہمارے طرزِ توجہ پہ خوش گمان نہ ہو
تجھے نہیں تری تابِ نظر کو دیکھتے ہیں

تکرارِ ساعت

ہمارے سامنے دریا ہیں سلسلوں کے رواں
پہ کیا کریں کہ تری چشمِ تر کو دیکھتے ہیں

ہم اہلِ حرص و ہوس تجھ سے بے نیاز کہاں
دعا کے بعد دعا کے اثر کو دیکھتے ہیں

یہ بے سبب نہیں سودا خلا نوردی کا
مسافرانِ عدم رہ گزر کو دیکھتے ہیں

وہ جس طرف ہو نظر اُس طرف نہیں اٹھتی
وہ جا چکے تو مسلسل اُدھر کو دیکھتے ہیں

ہمیں بھی اپنا مقلد شمار کر غالبؔ
کہ ہم بھی رشک سے تیرے ہنر کو دیکھتے ہیں

تکرارِ ساعت

کہاں نجانے چلا گیا انتظار کر کے
یہاں بھی ہوتا تھا ایک موسم بہار کر کے

جو ہم پہ ایسا نہ کارِ دنیا کا جبر ہوتا
تو ہم بھی رہتے یہاں جنوں اختیار کر کے

نجانے کس سمت جا بسی بادِ یاد پرور
ہمارے اطراف خوشبوؤں کا حصار کر کے

کٹیں گی کس دن مدار و محور کی یہ طنابیں
کہ تھک گئے ہم حسابِ لیل و نہار کر کے

تکرارِ ساعت

تری حقیقت پسند دنیا میں آ بسے ہیں
ہم اپنے خوابوں کی ساری رونق نثار کر کے

یہ دل تو سینے میں کس قرینے سے گونجتا تھا
عجیب ہنگامہ کر دیا بے قرار کر کے

ہر ایک منظر ہر ایک خلوت گنوا چکے ہیں
ہم ایک محفل کی یاد پر انحصار کر کے

تمام لمحے وضاحتوں میں گزر گئے ہیں
ہماری آنکھوں میں اک سخن کو غبار کر کے

یہ اب کھلا ہے کہ اس میں موتی بھی ڈھونڈنے تھے
کہ ہم تو بس آ گئے ہیں دریا کو پار کر کے

بقدرِ خوابِ طلب لہو ہے نہ زندگی ہے
ادا کرو گے کہاں سے اتنا ادھار کر کے

تکرارِ ساعت

اب ترے لمس کو یاد کرنے کا اک سلسلہ اور دیوانہ پن رہ گیا
تُو کہیں کھو گیا اور پہلو میں تیری شباہت لیے اک بدن رہ گیا

وہ سراپا ترا وہ ترے خال و خد میری یادوں میں سب منتشر ہو گئے
لفظ کی جستجو میں لرزتا ہوا نیم وا سا فقط اک دہن رہ گیا

حرف کے حرف سے کیا تضادات ہیں تُو نے بھی کچھ کہا میں نے بھی کچھ کہا
تیرے پہلو میں دنیا سمٹتی گئی میرے حصے میں حرفِ سخن رہ گیا

تیرے جانے سے مجھ پر یہ عقدہ کھلا رنگ و خوشبو تو بس تیری میراث تھے
ایک حسرت بچی رہ گئی گل بہ گل ایک ماتم چمن در چمن رہ گیا

تکرارِ ساعت

ایک بے نام خواہش کی پاداش میں تیری پلکیں بھی باہم پرو دی گئیں
ایک وحشت کو سیراب کرتے ہوئے میں بھی آنکھوں میں لے کر تھکن رہ گیا

عرصۂ خواب سے وقت موجود کے راستے میں گنوا دی گئی گفتگو
ایک اصرار کی بے بسی رہ گئی ایک انکار کا بانکپن رہ گیا

تُو ستاروں کو اپنی جلو میں لیے جا رہا تھا تجھے کیا خبر کیا ہوا
اک تمنا دریچے میں بیٹھی رہی ایک بستر کہیں بے شکن رہ گیا

تکرارِ ساعت

میرے سوا بھی کوئی گرفتار مجھ میں ہے
یا پھر مرا وجود ہی بے زار مجھ میں ہے

میری غزل میں ہے کسی لہجے کی بازگشت
اک یارِ خوش کلام و طرح دار مجھ میں ہے

حد ہے، کہ تُو نہ میری اذیت سمجھ سکا
شاید کوئی بلا کا اداکار مجھ میں ہے

تُو ہے کہ تیری ذات کا اقرار ہر نفس
میں ہوں کہ میری ذات کا انکار مجھ میں ہے

تجھ سے نہ کچھ کہا تو کسی سے نہ کچھ کہا
کتنی شدید خواہشِ اظہار مجھ میں ہے

میں کیا ہوں کائنات میں کچھ بھی نہیں ہوں میں
پھر کیوں اسی سوال کی تکرار مجھ میں ہے

جس دن سے میں وصال کی آسودگی میں ہوں
اُس دن سے وہ فراق سے دوچار مجھ میں ہے

میں ہوں کہ ایک پل کی بھی فرصت نہیں مجھے
وہ ہے کہ ایک عمر سے بے کار مجھ میں ہے

بے بس اسی کے زد میں یہ سب جاہ و طمطراق
جو اک غریب و بے کس و نادار مجھ میں ہے

میں ہوں وہ مسئلہ کہ مجھی سے جو حل نہ ہو
آسان جو نہ ہو وہی دشوار مجھ میں ہے

یہ کون ہے جو مجھ میں ہے میرا نگاہ دار
یہ کون ہے جو مجھ سے خبردار مجھ میں ہے

بس کوئی دیر ہے کہ اٹھے زندگی سے ہاتھ
عرفان کوئی کوچ پہ تیار مجھ میں ہے

تکرارِ ساعت

یہاں جو ہے کہاں اُس کا نشاں باقی رہے گا
مگر جو کچھ نہیں، وہ سب یہاں باقی رہے گا

سفر ہو گا سفر کی منزلیں معدوم ہوں گی
مکاں باقی نہ ہوگا لا مکاں باقی رہے گا

کبھی قریہ بہ قریہ اور کبھی عالم بہ عالم
غبارِ ہجرتِ بے خانماں باقی رہے گا

ہمارے ساتھ جب تک درد کی دھڑکن رہے گی
ترے پہلو میں ہونے کا گماں باقی رہے گا

تکرارِ ساعت

بہت بے اعتباری سے گزر کر دل ملے ہیں
بہت دن تک تکلف درمیاں باقی رہے گا

رہے گا آسماں جب تک زمیں باقی رہے گی
زمیں قائم ہے جب تک آسماں باقی رہے گا

یہ دنیا حشر تک آباد رکھی جا سکے گی
یہاں ہم سا جو کوئی خوش بیاں باقی رہے گا

جنوں کو ایسی عمرِ جاوداں بخشی گئی ہے
قیامت تک گروہِ عاشقاں باقی رہے گا

تمدن کو بچا لینے کی مہلت اب کہاں ہے
سرِ گرداب کب تک بادباں باقی رہے گا

کنارہ تا کنارہ ہو کوئی یخ بستہ چادر
مگر تہہ میں کہیں آبِ رواں باقی رہے گا

تکرارِ ساعت

ہمارا حوصلہ قائم ہے جب تک سائباں ہے
خدا جانے کہاں تک سائباں باقی رہے گا

تجھے معلوم ہے یا کچھ ہمیں اپنی خبر ہے
سو ہم مرجائیں گے تُو ہی یہاں باقی رہے گا

چلے آئے ہیں آنکھوں میں کسی کا عکس پا کر
یہ آنسو آج پھر کوئی تماشا چاہتے ہیں

تکرارِ ساعت

لفظوں کے برتنے میں بہت صرف ہوا میں
اک مصرعۂ تازہ بھی مگر کہہ نہ سکا میں

اک دستِ رفاقت کی طلب لے کے بڑھا میں
انبوہِ طرحدار میں اک شور اُٹھا میں!

آ تجھ کو تقابل میں الجھنے سے بچا لوں
سب کچھ ہے تری ذات میں، باقی جو بچا میں

میں اور کہاں خود نگری یاد ہے تجھ کو
جب تُو نے مرا نام لیا میں نے کہا میں؟

تکرارِ ساعت

میں ایک بگولہ سا اٹھا دشتِ جنوں سے
روکا مجھے دنیا نے بہت پر نہ رُکا میں

یا مجھ سے گزاری نہ گئی عمرِ گریزاں
یا عمرِ گریزاں سے گزارا نہ گیا میں

معلوم ہوا مجھ میں کوئی رمز نہیں ہے
اک عمرِ ریاضت سے گزرنے پہ کھلا میں

جو رات بسر کی تھی مرے ہجر میں تُو نے
اُس رات بہت دیر ترے ساتھ رہا میں

تکرارِ ساعت

اِدھر کچھ دن سے دل کی بے کلی کم ہوگئی ہے
تری خواہش ابھی ہے تو سہی، کم ہوگئی ہے

نظر دھندلا رہی ہے یا مناظر بجھ رہے ہیں
اندھیرا بڑھ گیا یا روشنی کم ہوگئی ہے

ترا ہونا تو ہے بس ایک صورت کا اضافہ
تیرے ہونے سے کیا تیری کمی کم ہوگئی ہے

خموشی کو جنوں سے دست برداری نہ سمجھو
تجسس بڑھ گیا ہے سرکشی کم ہوگئی ہے

تکرارِ ساعت

ترا ربط اپنے گرد و پیش سے اتنا زیادہ
تو کیا خوابوں سے اب وابستگی کم ہو گئی ہے

سرِ طاقِ تمنا بجھ گئی ہے شمعِ امّید
اُداسی بڑھ گئی ہے بے دلی کم ہو گئی ہے

سبھی زندہ ہیں اور سب کی طرح میں بھی ہوں زندہ
مگر جیسے کہیں سے زندگی کم ہو گئی ہے

تکرارِ ساعت

یا ملاقات کے امکان سے باہر ہو جا
یا کسی دن مری فرصت کو میسّر ہو جا

تجھ کو معلوم نہیں ہے مری خواہش کیا ہے
مجھ پہ احسان نہ کر اور سبک سر ہو جا

ارتقا کیا تری قسمت میں نہیں لکھا ہے؟
اب تمنّا سے گزر میرا مقدّر ہو جا

بے حسی گر تری فطرت ہے تو ایسا کبھی کر
اپنے حق میں بھی کسی روز تُو پتھر ہو جا

تکرارِ ساعت

اس سے پہلے تو غزل بھی تھی گریزاں مجھ سے
حالتِ دل تُو ذرا اور بھی ابتر ہو جا

میں جہاں پاؤں رکھوں واں سے بگولا اُٹھّے
ریگِ صحرا مری وحشت کے برابر ہو جا

اے مرے حرفِ سخن تُو مجھے حیراں کر دے
تُو کسی دن مری امید سے بڑھ کر ہو جا

تکرارِ ساعت

دل کے پردے پہ چہرے ابھرتے رہے، مسکراتے رہے، اور ہم سو گئے
تیری یادوں کے جھونکے گزرتے رہے، تھپتھپاتے رہے، اور ہم سو گئے

یاد آتا رہا کوچۂ رفتگاں، سر پہ سایہ فگن ہجر کا آسماں
نارسائی کے صدمے اترتے رہے، دل جلاتے رہے، اور ہم سو گئے

ہجر کے رت جگوں کا اثر یوں ہوا، وصلِ جاناں کا لمحہ بسر یوں ہوا
دوش پر اُس کے گیسو بکھرتے رہے، گدگداتے رہے، اور ہم سو گئے

کیسے تجدیدِ عہدِ وفا کیجئے، غم مزا دے رہے ہیں سو کیا کیجئے
در پہ آ کے وہ اکثر ٹھہرتے رہے، کھٹکھٹاتے رہے، اور ہم سو گئے

تکرارِ ساعت

اوّل اوّل تو ہر شب قیامت ہوئی، رفتہ رفتہ ہمیں ایسی عادت ہوئی
گھر کے آنگن میں غم رقص کرتے رہے، غل مچاتے رہے، اور ہم سو گئے
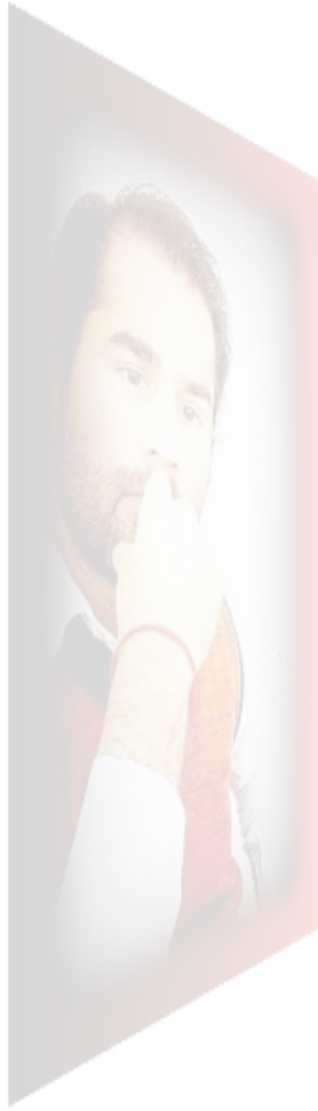
جس دن سے روزگار کو سب کچھ سمجھ لیا
راتیں خراب ہو گئیں اور دن سنور گئے

تکرارِ ساعت

چاند بھی کھویا کھویا سا ہے تارے بھی خوابیدہ ہیں
آج فضا کے بوجھل پن سے لہجے بھی سنجیدہ ہیں

جانے کن کن لوگوں سے اس درد کے کیا کیا رشتے تھے
ہجر کی اس آباد سرا میں سب چہرے نادیدہ ہیں

اتنے برسوں بعد بھی دونوں کیسے ٹوٹ کے ملتے ہیں
تُو ہے کتنا سادہ دل اور ہم کتنے پیچیدہ ہیں

سن جاناں ہم ترکِ تعلق اور کسی دن کر لیں گے
آج تجھے بھی عجلت سی ہے ہم بھی کچھ رنجیدہ ہیں

تکرارِ ساعت

کانوں میں اک سرگوشی ہے بے معنی سی سرگوشی
آنکھوں میں کچھ خواب سجے ہیں خواب بھی صبح رسید ہیں

گھر کی وہ مخدوش عمارت گر کے پھر تعمیر ہوئی
اب آنگن میں پیڑ ہیں جتنے سارے شاخ بریدہ ہیں

اس بستی میں ایک سڑک ہے جس سے ہم کو نفرت ہے
اس کے نیچے پگڈنڈی ہے جس کے ہم گرویدہ ہیں

تکرارِ ساعت

نظر کو پھر کوئی چہرہ دکھایا جا رہا ہے
یہ تم خود ہو کہ مجھ کو آزمایا جا رہا ہے

بہت آسودگی سے روز و شب کٹنے لگے ہیں
مجھے معلوم ہے مجھ کو گنوایا جا رہا ہے

سرِ مژگاں بگولے آ کے واپس جا رہے ہیں
عجب طوفان سینے سے اٹھایا جا رہا ہے

مرا غم ہے اگر کچھ مختلف تو اس بنا پر
مرے غم کو ہنسی میں کیوں اڑایا جا رہا ہے

تکرارِ ساعت

بدن کس طور شامل تھا مرے کارِ جنوں میں
مرے دھوکے میں اس کو کیوں مٹایا جا رہا ہے

وہ دیوارِ انا جس نے مجھے تنہا کیا تھا
اسی دیوار کو مجھ میں گرایا جا رہا ہے

مری خوشیوں میں تیری اس خوشی کو کیا کہوں میں
چراغِ آرزو! تجھ کو بجھایا جا رہا ہے

خرد کی سادگی دیکھو کہ ظاہر حالتوں سے
مری وحشت کا اندازہ لگایا جا رہا ہے

ابھی اے بادِ وحشت اس طرف کا رخ نہ کرنا
یہاں مجھ کو بکھرنے سے بچایا جا رہا ہے

تکرارِ ساعت

مراسم کی ضرورت خندہ پیشانی کہاں تک ہے
رویّوں کی اذیّت ناک یکسانی کہاں تک ہے

ذرا آنسو رکیں تو میں بھی دیکھوں اس کی آنکھوں میں
اُداسی کس قدر ہے اور پشیمانی کہاں تک ہے

نہ جانے انکشافِ ذات سے خود مجھ پہ کیا گزرے
کسے معلوم تابِ چشمِ حیرانی کہاں تک ہے

کہیں تو جا کے سمٹے گا ترا کارِ جہاں بانی
کبھی تُو بھی تو دیکھے گا کہ ویرانی کہاں تک ہے

تکرارِ ساعت

کبھی تو چند لمحے خود سے باہر بھی بسر کر لوں
ذرا دیکھوں تو وحشت کی فراوانی کہاں تک ہے

کسے معلوم بعد از باریابی کیا تماشا ہو
خبر کیا نا رسائی کی یہ آسانی کہاں تک ہے

کبھی وہ بے حجابانہ ملے تو پھر کھلے مجھ پر
کہ میرے بس میں آخر دل کی جولانی کہاں تک ہے

تلاطم خیزیٔ خواہش نہ تھی اُس کے تخاطب میں
مگر آنکھیں بتاتی تھیں کہ طغیانی کہاں تک ہے

کہاں تک دل کو میں اس یاد پُر معمور رکھوں گا
مرے ذمّے ترے غم کی نگہبانی کہاں تک ہے

رفو گر! میں تو شہرِ عشق سے باہر نہیں جاتا
میں کیا جانوں کہ رسمِ چاک دامانی کہاں تک ہے

تکرارِ ساعت

چھلک رہی ہے جو مجھ میں وہ تشنگی ہی نہ ہو
وہ شے جو دل میں فراواں ہے بے دلی ہی نہ ہو

گزر رہا ہے تُو کس سے گریز کرتا ہوا
ٹھہر کے دیکھ لے اے دل کہیں خوشی ہی نہ ہو

ترے سکوت سے بڑھ کر نہیں ہے تیرا سخن
مرا سخن بھی کہیں میری خامشی ہی نہ ہو

میں شہرِ جاں سے اُسی کی طرف ہی لوٹوں گا
یہ اور بات کہ اب میری واپسی ہی نہ ہو

تکرارِ ساعت

وہ آج مجھ سے کوئی بات کہنے والا ہے
میں ڈر رہا ہوں کہ یہ بات آخری ہی نہ ہو

نہ ہو وہ شخص مزاجاً ہی سرد مہر کہیں
میں بے رُخی جسے کہتا ہوں بے حسی ہی نہ ہو

یہ کیا سفر ہے کہ جس کی مسافتیں گُم ہیں
عجب نہیں کہ مری ابتدا ہوئی ہی نہ ہو

ہر اعتبار سے رہتا ہے با مراد وہ دل
امید جس نے کبھی اختیار کی ہی نہ ہو

عجیب ہے یہ مری لا تعلقی جیسے
جو کر رہا ہوں بسر میری زندگی ہی نہ ہو

یہ شعلگی تو صفت ہے الم نصیبوں کی
جو غم نہ ہو تو کسی دل میں روشنی ہی نہ ہو

تکرارِ ساعت

کہیں غرور کا پردہ نہ ہو یہ کم سخنی
یہ عجز اصل میں احساسِ برتری ہی نہ ہو

مرے سپرد کیا اُس نے فیصلہ اپنا
یہ اختیار کہیں میری بے بسی ہی نہ ہو

کچھ آنکھ بھی ہے سطح سے آگے کی کھوج میں
کچھ دل بھی اک خیال میں ڈوبا ہوا سا ہے

تکرارِ ساعت

تیری یاد کی خوشبو نے باہیں پھیلا کر رقص کیا
کل تو اک احساس نے میرے سامنے آ کر رقص کیا

اپنی ویرانی کا سارا رنج بُھلا کر صحرا نے
میری دل جوئی کی خاطر خاک اڑا کر رقص کیا

پہلے میں نے خوابوں میں پھیلائی درد کی تاریکی
پھر اُس میں اک جھلمل روشن یاد سجا کر رقص کیا

دیواروں کے سائے آ کر میرے جلو میں ناچ اٹھے
میں نے اُس پُر ہول گلی میں جب بھی جا کر رقص کیا

تکرارِ ساعت

اُس کی آنکھوں میں کل شب ایک تلاش مجسم تھی
میں نے بھی کیسے بازو لہرا لہرا کر رقص کیا

اُس کا عالم دیکھنے والا تھا جس دم اک ہُو گونجی
پہلے پہل تو اُس نے کچھ شرما شرما کر رقص کیا

رات گئے جب سناٹا سر گرم ہوا تنہائی میں
دل کی ویرانی نے دل سے باہر آ کر رقص کیا

دن بھر ضبط کا دامن تھامے رکھا خوش اسلوبی سے
رات کو تنہا ہوتے ہی کیا وجد میں آ کر رقص کیا

مجھ کو دیکھ کے ناچ اٹھی اک موج بھنور کے حلقے میں
نرم ہوا نے ساحل پر اک نقش بنا کر رقص کیا

بے خوابی کے سائے میں جب دو آنکھیں بے عکس ہوئیں
خاموشی نے وحشت کی تصویر اٹھا کر رقص کیا

تکرارِ ساعت

کل عرفاں کا ذکر ہوا جب محفل میں تو دیکھو گے
یاروں نے ان مصرعوں کو دہرا دہرا کر رقص کیا
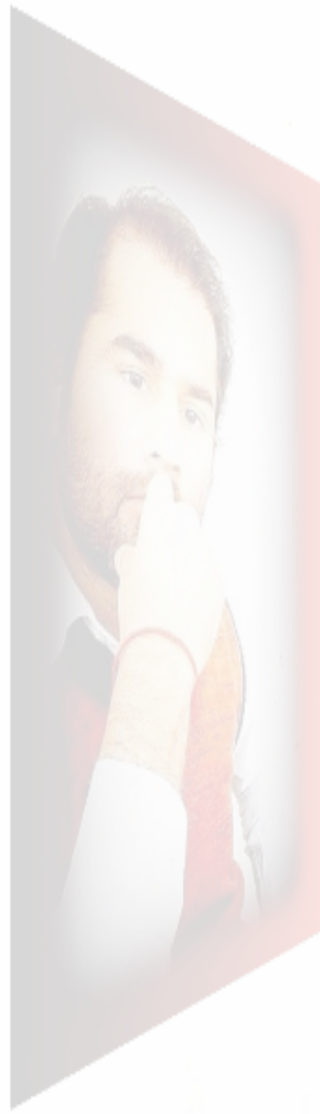
بے رونقی سے کوچہ و بازار بھر گئے
آوارگانِ شہر کہاں جا کے مر گئے

تکرارِ ساعت

ملے گا کیا تجھے اے دل یہ تجربہ کر کے
ابھی تو زخم بھرے ہیں خدا خدا کر کے

ہمیں بھی روز جگاتی تھی آ کے ایک مہک
چمن میں کوئی ہمارا بھی تھا صبا کر کے

سخن میں تیرے تغافل سے آ گیا یہ ہنر
ذرا سا غم بھی سناتے ہیں سانحہ کر کے

اُداس تھے سو ترے در پہ آ کے بیٹھ گئے
فقیر ہیں سو چلے جائیں گے صدا کر کے

تکرارِ ساعت

ابھی ہوئی ہے پلک سے پلک ذرا مانوس
ابھی نہ جا مجھے اس خواب سے رہا کر کے

عجب نہیں کہ کوئی بات مجھ میں ہو میری
کبھی تو دیکھ مجھے خود سے تُو جدا کر کے
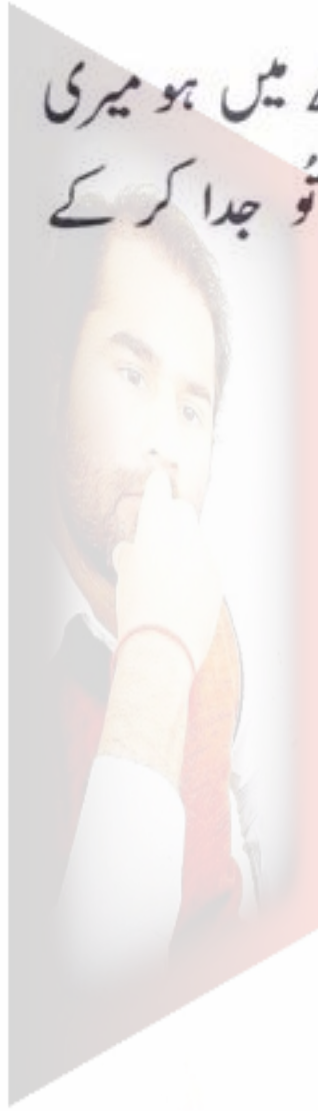
ہمیں بھی سودا کہاں تھا ایسا کہ اپنے دل میں ملال رکھتے
اگر تُو اپنا خیال رکھتا تو ہم بھی اپنا خیال رکھتے

تکرارِ ساعت

کوئی نغمہ بُو، چاندنی نے کہا، چاندنی کے لیے ایک تازہ غزل
کوئی تازہ غزل، پھر کسی نے کہا، پھر کسی کے لیے ایک تازہ غزل

زخمِ فرقت کو پلکوں سے سیتے ہوئے، سانس لینے کی عادت میں جیتے ہوئے
اب بھی زندہ ہو تم، زندگی نے کہا، زندگی کے لیے ایک تازہ غزل

اُس کی خواہش پہ تم کو بھروسہ بھی ہے، اُس کے ہونے نہ ہونے کا جھگڑا بھی ہے
لطف آیا تمھیں، گمرہی نے کہا، گمرہی کے لیے ایک تازہ غزل

ایسی دنیا میں کب تک گزارا کریں، تم ہی کہہ دو کہ کیسے گوارا کریں
رات مجھ سے مری بے بسی نے کہا، بے بسی کے لیے ایک تازہ غزل

تکرارِ ساعت

منظروں سے بہلنا ضروری نہیں گھر سے باہر نکلنا ضروری نہیں
دل کو روشن کرو، روشنی نے کہا، روشنی کے لیے ایک تازہ غزل

میں عبادت بھی ہوں، میں محبت بھی ہوں، زندگی کی، نمو کی علامت بھی ہوں
میری پلکوں پہ ٹھہری نمی نے کہا، اس نمی کے لیے ایک تازہ غزل

آرزوؤں کی مالا پرونے سے ہیں، یہ زمیں آسماں میرے ہونے سے ہیں
مجھ پہ بھی کچھ کہو، آدمی نے کہا، آدمی کے لیے ایک تازہ غزل

اپنی تنہائی میں رات میں تھا مگن، ایک آہٹ ہوئی دھیان میں دفعتاً
مجھ سے باتیں کرو، خامشی نے کہا، خامشی کے لیے ایک تازہ غزل

جب رفاقت کا ساماں بہم کر لیا، میں نے آخر اسے ہم قدم کر لیا
اب مرے دکھ سہو، ہمرہی نے کہا، ہمرہی کے لیے ایک تازہ غزل

تکرارِ ساعت

ڈرا رہا ہے مسلسل یہی سوال مجھے
گزار دیں گے یونہی کیا یہ ماہ و سال مجھے

بچھڑتے وقت اضافہ نہ اپنے رنج میں کر
یہی سمجھ کہ ہوا ہے بہت ملال مجھے

وہ شہرِ ہجر عجب شہرِ پُر تحیر تھا
بہت دنوں میں تو آیا ترا خیال مجھے

تُو میرے خواب کو عجلت میں رائگاں نہ سمجھ
ابھی سخن گہِ امکاں سے مت نکال مجھے

تکرارِ ساعت

کسے خبر کہ تہِ خاک آگ زندہ ہو
ذرا سی دیر ٹھہر ، اور دیکھ بھال مجھے

کہاں کا وصل کہ اس شہرِ پُر فشار میں اب
ترا فراق بھی لگنے لگا محال مجھے

اِسی کے دم سے تو قائم ابھی ہے تارِ نفس
یہ اک امید کہ رکھتی ہے پُر سوال مجھے

کہوں میں تازہ غزل اے ہوائے تازہ دلی
ذرا سی دیر کو رکھے جو تُو بحال مجھے

خرامِ عمر کسی شہرِ پُر ملال کو چل
کیے ہوئے ہے یہ آسودگی نڈھال مجھے

کہاں سے لائیں بھلا ہم جوازِ ہم سفری
تجھے عزیز ترے خواب، میرا حال مجھے

تکرارِ ساعت

اُبھر رہا ہوں میں سطحِ عدم سے نقش بہ نقش
تری ہی جلوہ گری ہوں ذرا اُجال مجھے

یہاں تو حبس بہت ہے سو گردِ بادِ جنوں
مدارِ وقت سے باہر کہیں اچھال مجھے

پھر اس کے بعد نہ تُو ہے، نہ یہ چراغ، نہ میں
سحر کی پہلی کرن تک ذرا سنبھال مجھے

تکرارِ ساعت

ہونے کا اظہار نہیں ہے، صرف خیال میں زندہ ہوں
عمر کا کچھ احوال نہیں ہے اور مآل میں زندہ ہوں

ٹھیک ہے میرا ہونا تیرے ہونے سے مشروط نہیں
لیکن اتنا یاد رہے میں ایک ملال میں زندہ ہوں

اپنا دل برباد کیا تو پھر یہ گھر آباد ہوا
پہلے میں اک عرش نشیں تھا اب پاتال میں زندہ ہوں

اک امکان کی بے چینی سے ایک محال کی وحشت تک
میں کس حال میں زندہ تھا اور میں کس حال میں زندہ ہوں

تکرارِ ساعت

دنیا میری ذات کو چاہے رد کر دے، تسلیم کرے
میں تو یوں بھی تیرے غم کے استدلال میں زندہ ہوں

کتنی جلدی سمٹا ہوں میں وسعت کی اس ہیبت سے
کل تک عشق میں زندہ تھا میں آج وصال میں زندہ ہوں

ایک فنا کی گردش ہے یہ ایک بقا کا محور ہے
ایک دلیل نے مار دیا ہے ایک سوال میں زندہ ہوں
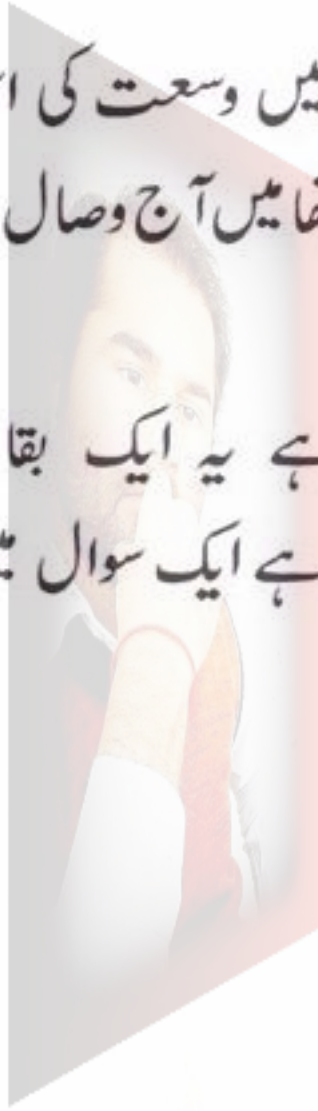
تکرارِ ساعت

شکستِ خواب کا ہمیں ملال کیوں نہیں رہا
بچھڑ گئے تو پھر ترا خیال کیوں نہیں رہا

اگر یہ عشق ہے تو پھر وہ شدتیں کہاں گئیں
اگر یہ وصل ہے تو پھر محال کیوں نہیں رہا

وہ زلف رات کیوں بکھر بکھر کے رہ گئی
وہ خواب خواب سلسلہ بحال کیوں نہیں رہا

وہ سایہ جو بجھا تو کیا بدن بھی ساتھ بجھ گیا
نظر کو تیرگی کا اب ملال کیوں نہیں رہا

تکرارِ ساعت

وہ دور جس میں آگہی کے در کھلے تھے کیا ہوا
زوال تھا تو عمر بھر زوال کیوں نہیں رہا

کہیں سے نقش بجھ گئے کہیں سے رنگ اڑ گئے
یہ دل ترے خیال کو سنبھال کیوں نہیں رہا

بہارِ جاں سے تجھے باریاب کر دیں گے
نظر اٹھائیں گے چہرہ گلاب کر دیں گے

تکرارِ ساعت

جاگتے ہیں تری یاد میں رات بھر، ایک سنسان گھر، چاندنی اور میں
بولتا کوئی کچھ بھی نہیں ہے مگر، ایک زنجیرِ در، خامشی اور میں

اک اذیّت میں رہتے ہوئے مستقل، ایک لمحے کو غافل نہیں ذہن و دل
کچھ سوالات ہیں ان کے پیشِ نظر، انتہا کی خبر، آگہی اور میں

تیری نسبت سے اب یاد کچھ بھی نہیں، اُس تعلق کی روداد کچھ بھی نہیں
اب جو سوچوں تو بس یاد ہے اس قدر، ایک پہلی نظر، تشنگی اور میں

کس مسافت میں ہوں دیکھ میرے خدا، ایسی حالت میں تُو میری ہمت بندھا
یہ کڑی رہ گزر، رائگانی کا ڈر، مضمحل بال و پر، بے بسی اور میں

تکرارِ ساعت

اُس کو پانے کی اب جستجو بھی نہیں، جستجو کیا کریں آرزو بھی نہیں
شوقِ آوارگی بول جائیں کدھر، ہو گئے در بہ در، زندگی اور میں

لمحہ لمحہ اجڑتا ہوا شہرِ جاں، لحظہ لحظہ ہوئے جا رہے ہیں دھواں
پھول پتے شجر، منتظر چشم تر، رات کا یہ پہر، روشنی اور میں

گفتگو کا بہانہ بھی کم رہ گیا، رشتۂ لفظ و معنی بھی کم رہ گیا
ہے یقیناً کسی کی دعا کا اثر، آج زندہ ہیں گر، شاعری اور میں
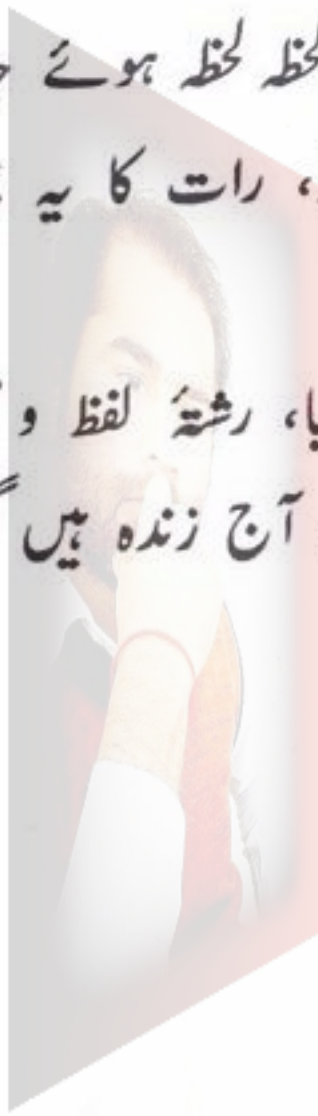
تکرارِ ساعت

سمجھوتہ کوئی وقت سے کرنے کا نہیں میں
اب ترکِ مراسم سے بھی ڈرنے کا نہیں میں

زنجیر کوئی لا مری وحشت کے برابر
اس حلقۂ مژگاں میں ٹھہرنے کا نہیں میں

کل رات عجب دشتِ بلا پار کیا ہے
سو بادِ سحر سے تو سنورنے کا نہیں میں

کیوں مملکتِ عشق سے بے دخل کیا تھا
اب مسندِ غم سے تو اترنے کا نہیں میں

تکرارِ ساعت

دم بھر کے لیے کوئی ساعت ہو میسّر
بے صوت و صدا جاں سے گزرنے کا نہیں میں

اب چشمِ تماشا کو جھپکنے نہیں دینا
اس بار جو ڈوبا تو ابھرنے کا نہیں میں

ہر شکل ہے مجھ میں مری صورت کے علاوہ
اب اس سے زیادہ تو نکھرنے کا نہیں میں
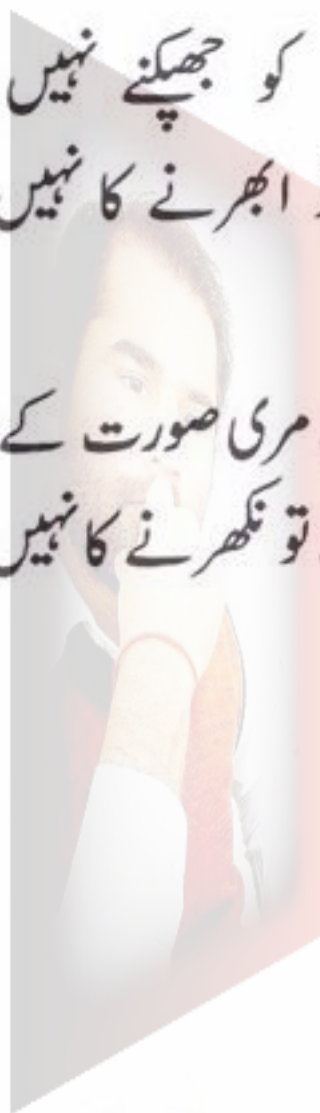
تکرارِ ساعت

رفتگاں کی صدا نہیں، میں ہوں
یہ ترا واہمہ نہیں، میں ہوں

تیرے ماضی کے ساتھ دفن کہیں
میرا اک واقعہ نہیں، میں ہوں

کیا ملا انتہا پسندی سے؟
کیا میں تیرے سوا نہیں، میں ہوں

ایک مدت میں جا کے مجھ پہ کھلا
چاند حسرت زدہ نہیں، میں ہوں

تکرارِ ساعت

اس نے مجھ کو محال جان لیا
میں یہ کہتا رہا نہیں، میں ہوں

میں ہی عجلت میں آ گیا تھا ادھر
یہ زمانہ نیا نہیں، میں ہوں

میری وحشت سے ڈر گئے شاید
یارِ بادِ فنا نہیں، میں ہوں

میں ترے ساتھ رہ گیا ہوں کہیں
وقت ٹھہرا ہوا نہیں، میں ہوں

گاہے گاہے سخن ضروری ہے
سامنے آئنہ نہیں، میں ہوں

سرسری کیوں گزارتا ہے مجھے
یہ مرا ماجرا نہیں، میں ہوں

تکرارِ ساعت

اس نے پوچھا کہاں گیا وہ شخص
کیا بتاتا کہ تھا نہیں، میں ہوں

یہ کسے دیکھتا ہے مجھ سے اُدھر
تیرے آگے خلا نہیں، میں ہوں

خیالِ ترکِ تعلق جو ہو، تو مل لینا
کسی دعا کو ترا ہم رکاب کر دیں گے

تکرارِ ساعت
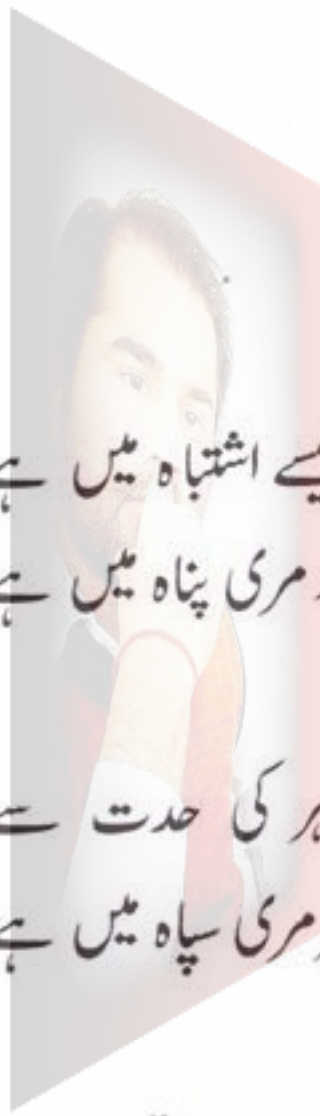
کوئی بتائے کہ وہ کیسے اشتباہ میں ہے
جو قید کر کے مجھے خود مری پناہ میں ہے

مقابلہ ہے مرا دوپہر کی حدت سے
بس ایک شام کا منظر مری سپاہ میں ہے

تری تمام ریا کاریوں سے واقف ہوں
یقین کر کہ بڑا لطف اس نباہ میں ہے

مرے سلوک میں شامل نہیں ہے بے خبری
ہر ایک شخص کا منصب مری نگاہ میں ہے

تکرارِ ساعت

ضمیر سے تو ابھی تک ہے خاکداں روشن
یہی چراغ مرے خیمۂ سیاہ میں ہے

میں معترف ہوں روایت کی پاسداری کا
کجی تو حسبِ ضرورت مری کلاہ میں ہے

سپردگی مری فطرت کے ہے خلاف مگر
یہ انکسار ترے غم کی بارگاہ میں ہے

ترے لیے بھی کوئی فیصلہ میں کر لوں گا
ابھی تو شوق تمنا کی سیرگاہ میں ہے

تکرارِ ساعت
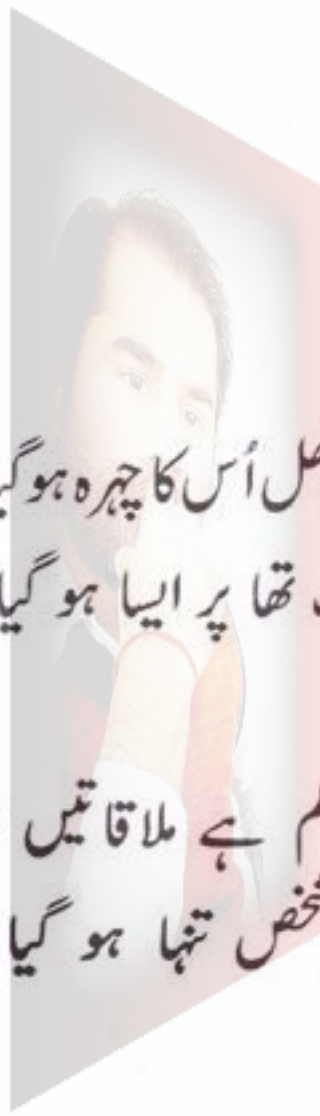
مرے خواب سے اوجھل اُس کا چہرہ ہو گیا ہے
میں ایسا چاہتا کب تھا پر ایسا ہو گیا ہے

تعلق اب یہاں کم ہے ملاقاتیں زیادہ
ہجومِ شہر میں ہر شخص تنہا ہو گیا ہے

تری تکمیل کی خواہش تو پوری ہو نہ پائی
مگر اک شخص مجھ میں بھی ادھورا ہو گیا ہے

جو باغِ آرزو تھا اب وہی ہے دشتِ وحشت
یہ دل کیا ہونے والا تھا مگر کیا ہو گیا ہے

تکرارِ ساعت

میں سمجھا تھا سیئے گی آگہی چاکِ جنوں کو
مگر یہ زخم تو پہلے سے گہرا ہو گیا ہے

میں تجھ سے ساتھ بھی تو عمر بھر کا چاہتا تھا
سو اب تجھ سے گلہ بھی عمر بھر کا ہو گیا ہے

ترے آنے سے آیا کون سا ایسا تغیر
فقط ترکِ مراسم کا مداوا ہو گیا ہے

مرا عالم اگر پوچھیں تو اُن سے عرض کرنا
کہ جیسا آپ فرماتے تھے ویسا ہو گیا ہے

میں کیا تھا اور کیا ہوں اور کیا ہونا ہے مجھ کو
مرا ہونا تو جیسے اک تماشا ہو گیا ہے

یقیناً ہم نے آپس میں کوئی وعدہ کیا تھا
مگر اس گفتگو کو ایک عرصہ ہو گیا ہے

تکرارِ ساعت

اگرچہ دسترس میں آ گئی ہے ساری دنیا
مگر دل کی طرف بھی ایک در وا ہو گیا ہے

یہ بے چینی ہمیشہ سے مری فطرت ہے لیکن
بقدرِ عمر اس میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے

مجھے ہر صبح یاد آتی ہے بچپن کی وہ آواز
چلو عرفان اٹھ جاؤ سویرا ہو گیا ہے

تکرارِ ساعت

رزق کی جستجو میں کسے تھی خبر، تُو بھی ہو جائے گا رائگاں یا اخی
تیری آسودہ حالی کی امید پر، کر گئے ہم تو اپنا زیاں یا اخی

جب نہ تھا یہ بیابانِ دیوار و در، جب نہ تھی یہ سیاہی بھری رہگزر
کیسے کرتے تھے ہم گفتگو رات بھر، کیسے سنتا تھا یہ آسماں یا اخی

جب یہ خواہش کا انبوہِ وحشت نہ تھا، شہر اتنا تہی دستِ فرصت نہ تھا
کتنے آباد رہتے تھے اہلِ ہنر، ہر نظر تھی یہاں مہرباں یا اخی

یہ گروہِ اسیرانِ کذب و ریا، بندگانِ درم بندگانِ انا
ہم فقط اہلِ دل یہ فقط اہلِ زر، عمر کیسے کٹے گی یہاں یا اخی

تکرارِ ساعت

خود کلامی کا یہ سلسلہ ختم کر، گوش و آواز کا فاصلہ ختم کر
اک خموشی ہے پھیلی ہوئی سر بہ سر، کچھ سخن چاہیے درمیاں یا اخی

جسم کی خواہشوں سے نکل کر چلیں، زاویہ جستجو کا بدل کا چلیں
ڈھونڈنے آگہی کی کوئی رہگزر، روح کے واسطے سائباں یا اخی

ہاں کہا تھا یہ ہم نے بچھڑتے ہوئے، لوٹ آئیں گے ہم عمر ڈھلتے ہوئے
ہم نے سوچا بھی تھا واپسی کا مگر، پھر یہ سوچا کہ تُو اب کہاں یا اخی

خود شناسی کے لمحے بہم کب ہوئے، ہم جو تھے درحقیقت وہ ہم کب ہوئے
تیرا احسان ہو تُو بتا دے اگر، کچھ ہمیں بھی ہمارا نشاں یا اخی

قصۂ رنج و حسرت نہیں مختصر، تجھ کو کیا کیا بتائے گی یہ چشمِ تر
آتشِ غم میں جلتے ہیں قلب و جگر، آنکھ تک آ رہا ہے دھواں یا اخی

عمر کے باب میں اب رعایت کہاں، سمت تبدیل کرنے کی مہلت کہاں
دیکھ بادِ فنا کھٹکھٹاتی ہے در، ختم ہونے کو ہے داستاں یا اخی

تکرارِ ساعت

ہو چکا سب جو ہونا تھا سود و زیاں، اب جو سوچیں تو کیا رہ گیا ہے یہاں
اور کچھ فاصلے کا یہ رختِ سفر، اور کچھ روز کی نقدِ جاں یا اخی

تُو ہمیں دیکھ آ کر سرِ انجمن، یوں سمجھ لے کہ ہیں جانِ بزمِ سخن
ایک تو روداد دلچسپ ہے اس قدر، اور اس پر ہمارا بیاں یا اخی
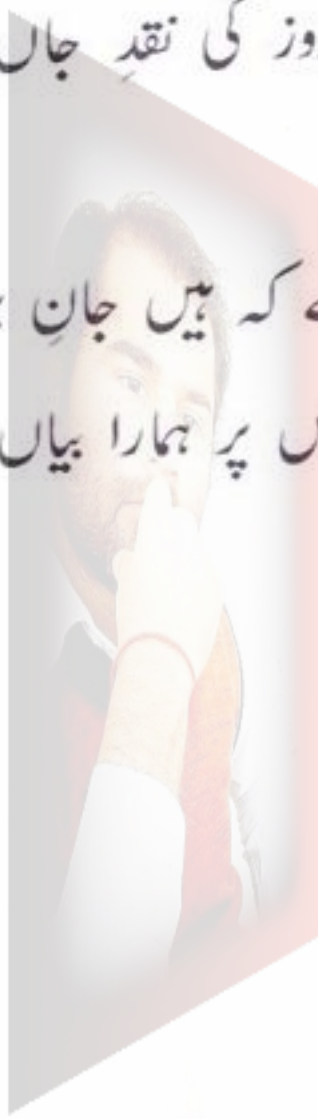
اک عکس کھو گیا ہے مرے دن کے پیچ میں
اک خواب میری رات سے الجھا ہوا سا ہے

تکرارِ ساعت

وہ چہرہ پُر یقیں ہے گرد سا ہوتے ہوئے بھی
میں سرتا پا گماں ہوں آئنہ ہوتے ہوئے بھی

وہ اک روزن قفس کا جس میں کرنیں ناچتی تھیں
مری نظریں اُسی پر تھیں رِہا ہوتے ہوئے بھی

مرے قصے کی بے رونق فضا مجھ میں نہیں ہے
میں پُر احوال ہوں بے ماجرا ہوتے ہوئے بھی

شرف حاصل رہا ہے مجھ کو اُس کی ہمرہی کا
بہت مغرور ہوں میں خاکِ پا ہوتے ہوئے بھی

تکرارِ ساعت

وہ چہرہ جگمگا اٹھا نشاطِ آرزو سے
وہ پلکیں اٹھ گئیں بارِ حیا ہوتے ہوئے بھی

مجھے تُو نے بدن سمجھا ہوا تھا ورنہ میں تو
تری آغوش میں اکثر نہ تھا ہوتے ہوئے بھی

چلا جاتا ہوں دل کی سمت بھی گاہے بہ گاہے
میں ان آسائشوں میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی

عجب وسعت ہے شہرِ عشق کی وسعت کہ مجھ کو
جنوں لگتا ہے کم بے انتہا ہوتے ہوئے بھی

اگر تیرے لیے دنیا بقا کا سلسلہ ہے
تو پھر تُو دیکھ لے مجھ کو فنا ہوتے ہوئے بھی

مسلسل قرب نے کیسا بدل ڈالا ہے تجھ کو
وہی لہجہ وہی ناز و ادا ہوتے ہوئے بھی

تکرارِ ساعت

وہ غم جس سے کبھی میں اور تم یکجا ہوئے تھے
بس اُس جیسا ہی اک غم ہے جدا ہوتے ہوئے بھی

نہ جانے مستقل کیوں ایک ہی گردش میں گم ہوں
میں رمزِ عشق سے کم آشنا ہوتے ہوئے بھی
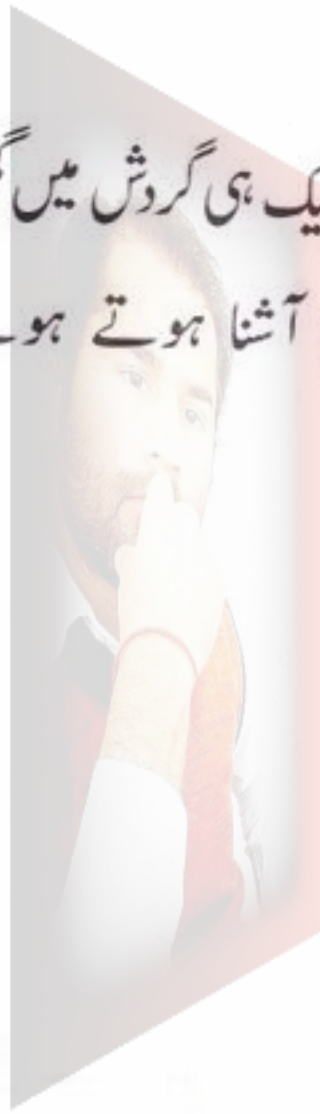
قدم جما نہ سکا رہگزارِ وقت پہ میں
میں اک اُچٹتا سا لمحہ، مری کہانی کیا

تکرارِ ساعت

طلب تو جزوِ تمنا کبھی رہی بھی نہیں
سواب کسی کے نہ ہونے سے کچھ کمی بھی نہیں

ہمیں تمہاری طرف روز کھینچ لاتی تھی
وہ ایک بات جو تم نے کبھی کہی بھی نہیں

وہ سب خیال کے موسم کسی نگاہ سے تھے
سو اب خوشی بھی نہیں دل گرفتگی بھی نہیں

کرم کیا کہ رُکے تم نگاہ بھر کے لیے
نظر کو اس سے زیادہ کی تاب تھی بھی نہیں

تکرارِ ساعت

وہ ایک پل ہی سہی جس میں تم میسّر ہو
اُس ایک پل سے زیادہ تو زندگی بھی نہیں

کسی کی سمت کچھ ایسے بڑھی تھی چشمِ طلب
صدائے دل پہ پلٹتی تو کیا رُکی بھی نہیں

یہ جانتے تو مزاج آشنا ہی کیوں ہوتے
جو روز تھا وہ سخن اب کبھی کبھی بھی نہیں

سنا رہے ہو ہمیں کس نگاہِ ناز کے غم
ہم اُس کے سامنے ہوتے تو پوچھتی بھی نہیں

ہزار تلخ مراسم سہی پہ ہجر کی بات
اُسے پسند نہ تھی اور ہم نے کی بھی نہیں

تکرارِ ساعت

یونہی بے یقیں یونہی بے نشاں، مری آدھی عمر گزر گئی
کہیں ہو نہ جاؤں میں رائگاں، مری آدھی عمر گزر گئی

کبھی سائباں نہ تھا بہم، کبھی کہکشاں تھی قدم قدم
کبھی بے مکاں کبھی لا مکاں، مری آدھی عمر گزر گئی

ترے وصل کی جو نوید ہے، وہ قریب ہے کہ بعید ہے
مجھے کچھ خبر تو ہو جانِ جاں، مری آدھی عمر گزر گئی

کبھی مجھ کو فکرِ معاش ہے، کبھی آپ اپنی تلاش ہے
کوئی گُر بتا مرے نکتہ داں، مری آدھی عمر گزر گئی

تکرارِ ساعت

کبھی ذکرِ حرمتِ حرف میں، کبھی فکرِ آمد و صرف میں
یونہی رزق و عشق کے درمیاں، مری آدھی عمر گزر گئی

کوئی طعنہ زن مری ذات پر، کوئی خندہ زن کسی بات پر
پئے دل نوازئ دوستاں، مری آدھی عمر گزر گئی

ابھی وقت کچھ مرے پاس ہے، یہ خبر نہیں ہے قیاس ہے
کوئی کر گلہ مرے بد گماں، مری آدھی عمر گزر گئی

اُسے پا لیا اُسے کھو دیا، کبھی ہنس دیا کبھی رو دیا
بڑی مختصر سی ہے داستاں، مری آدھی عمر گزر گئی

تری ہر دلیل بہت بجا، مگر انتظار بھی تا کجا
ذرا سوچ تو مرے رازداں، مری آدھی عمر گزر گئی

کہاں کائنات میں گھر کروں، میں یہ جان لوں تو سفر کروں
اسی سوچ میں تھا کہ ناگہاں، مری آدھی عمر گزر گئی

تکرارِ ساعت

خانۂ دل کی طرح ساری فضا ہے کہ نہیں
کس کو معلوم کہ باہر بھی ہوا ہے کہ نہیں

جشن برپا تو ہوا تھا دمِ رخصت لیکن
وہی ہنگامہ مرے بعد بپا ہے کہ نہیں

پوچھتا ہے یہ ہر اک خارِ سرِ دشتِ طلب
آنے والا بھی کوئی آبلہ پا ہے کہ نہیں

دیکھ تو جا کہ مسیحائے غمِ عشق اُسے
ہاتھ اب تک یونہی سینے پہ دھرا ہے کہ نہیں

تکرارِ ساعت

دل کے تاریک در و بام سے اکثر تراغم
پوچھتا ہے کہ کوئی میرے سوا ہے کہ نہیں

میں کہیں ہوں کہ نہیں ہوں، وہ کبھی تھا کہ نہ تھا
خود ہی کہہ دے یہ سخن بے سر و پا ہے کہ نہیں

فیصلہ لوٹ کے جانے کا ہے دشوار بہت
کس سے پوچھوں وہ مجھے بھول چکا ہے کہ نہیں

میں تو وارفتگیِ شوق میں جاتا ہوں اُدھر
نہیں معلوم وہ آغوش بھی وا ہے کہ نہیں

جانے کیا رنگ چمن کا ہے دمِ صبحِ فراق
گُل کھلے ہیں کہ نہیں بادِ صبا ہے کہ نہیں

اے شبِ ہجر ذرا دیر کو بہلے تو یہ دل
دیکھ عرفانؔ کہیں نغمہ سرا ہے کہ نہیں

تکرارِ ساعت

سرِ صحرائے یقیں شہرِ گماں چاہتے ہیں
ہم کسی شے کو بھی موجود کہاں چاہتے ہیں

جس سے اٹھتے ہیں قدم راہِ جنوں خیز میں تیز
ہم بھی شانے پہ وہی بارِ گراں چاہتے ہیں

رُخ نہ کر جانبِ دنیا کہ اسیرانِ نظر
تجھ کو ہر دم اسی جانب نگراں چاہتے ہیں

ایسے گرویدہ کہاں ہیں لب و رخسار کے ہم
ہم تو بس قربتِ شیریں سخناں چاہتے ہیں

تکرارِ ساعت

چاہتے ہیں کہ وہ تا عمر رہے پیشِ نظر
ایک تصویر سرِ آبِ رواں چاہتے ہیں

جس میں سیراب ہیں آنکھیں جہاں آباد ہیں دل
ہم اُسی شہرِ تخیل میں مکاں چاہتے ہیں

رازِ ہستی سے جو پردہ نہیں اُٹھتا، نہ اُٹھے
آپ کیوں اپنے تجسس کا زیاں چاہتے ہیں

شام ہوتے ہیں لگاتے ہیں درِ دل پہ صدا
آبلہ پا ہیں، اکیلے ہیں، اماں چاہتے ہیں

دُور عرفانؔ رہو اُن سے کہ جو اہلِ سخن
التفاتِ نگہَ کم نظراں چاہتے ہیں

تکرارِ ساعت

تجھ کو چشمِ تحیّر سے • ہوا، صرف میں ہی نہیں آئنہ بھی تو ہے
جانِ من حُسن کی بات اپنی جگہ، مسئلہ کوئی اس کے سوا بھی تو ہے

دشتِ فرقت کی اس تشنگی تک نہیں، آزمائش فقط ہجر ہی تک نہیں
اس سے آگے تمنا کے اظہار کا، ایک دشوار تر مرحلہ بھی تو ہے

میرا لہجہ تعلق سے بھرپور تھا، اور چہرہ تاثر سے معمور تھا
خال و خد سے اُدھر لفظ سے ماورا، ایک احوالِ بے ماجرا بھی تو ہے

حُسن تیرا بہت جاں فزا ہی سہی، روح پرور سہی خوش ادا ہی سہی
سن مگر دل رُبا تیرا نغمہ سرا، دیکھتا ہی نہیں سوچتا بھی تو ہے

تکرارِ ساعت

حرف کی جستجو میں پگھلتا رہا، شاعرِ خوش نوا روز جلتا رہا
تُو سنے تو سنے ورنہ ہر بات کا، سننے والا کہیں اک خدا بھی تو ہے

کس قدر خوش نفس، کس قدر خوش ادا، یاد کے پھول کھلتے ہوئے جا بہ جا
عشق کی راہ میں غم اگر ہیں تو کیا، عشق کے دم سے ایسی فضا بھی تو ہے

وہ توقع پہ پورا اترتا نہیں، میں اگر چپ رہوں تو سمجھتا نہیں
یوں تو کہنے کو ہے وہ مرا ہم نوا، اک سخن کا مگر فاصلہ بھی تو ہے

وہ نہیں تو سخن کی ضرورت نہیں، مجھ کو سب سے تکلم کی عادت نہیں
ہجر سے کچھ سوا ہے مرا واقعہ، حرف کی موت کا سانحہ بھی تو ہے

تکرارِ ساعت

جنوں کے دم سے آخر مرتبہ کیسا ملا مجھ کو
ابھی فرہاد و قیس آئے تھے کہنے مرحبا مجھ کو

کسی صورت بھی رد ہوتا نہیں یہ فیصلہ دل کا
نظر آتا نہیں کوئی بھی تجھ سا دوسرا مجھ کو

سرِ کنجِ تمنا پھر خوشی سے گنگناؤں گا
اگر وہ لوٹ کر آئے تو پھر تم دیکھنا مجھ کو

نہ جانے رشک سے، غصے سے، غم سے یا رقابت سے
یہ کس انداز سے • ہے تیرا آئنہ مجھ کو

تکرارِ ساعت

کھلے تو سب زمانوں کے خزانے ہاتھ آ جائیں
درِ اقلیمِ صد عالم ہے وہ بندِ قبا مجھ کو

گماں میں بھی گماں لگتی ہے اب تو زندگی میری
نظر آتا ہے اب وہ خواب میں بھی خواب سا مجھ کو

کثافت بار پا سکتی نہیں ایسی لطافت میں
کرم اس کا کہ بخشا دل کے بدلے آئنہ مجھ کو

صبا میری قدم بوسی سے پہلے گل نہ دیکھے گی
اگر وحشت نے کچھ دن باغ میں رہنے دیا مجھ کو

نہ نکلی آج گر کوئی یہاں یکجائی کی صورت
تو کل سے ڈھونڈتے پھرنا جہاں میں جا بہ جا مجھ کو

گزر گاہِ نفس میں ہوں مثالِ برگِ آوارہ
کوئی دم میں اڑا لے جائے گی بادِ فنا مجھ کو

تکرارِ ساعت

وہ دل آویز آنکھیں، وہ لب و رخسار، وہ زلفیں
نہیں اب دیکھنا کچھ بھی نہیں اس کے سوا مجھ کو

ازل سے تا ابد، دنیا سے لے کر آسمانوں تک
نظر آتا ہے تیری ہی نظر کا سلسلہ مجھ کو

مرے ہونے سے ہی کچھ اعتبار اس کا بھی قائم ہے
جنوں تم سے نمٹ لے گا جو دیوانہ کہا مجھ کو

کوئی عرفان مجھ میں سے مجھے آواز دیتا ہے
ارے تُو سوچتا کیا ہے کبھی کچھ تو بتا مجھ کو

تکرارِ ساعت

بتاتا ہے مجھے آئینہ کیسی بے رُخی سے
کہ میں محروم ہوتا جا رہا ہوں روشنی سے

کسے الزام دوں میں رائگاں ہونے کا اپنے
کہ سارے فیصلے میں نے کیے خود ہی خوشی سے

ہر اک لمحہ مجھے رہتی ہے تازہ اک شکایت
کبھی تجھ سے، کبھی خود سے، کبھی اس زندگی سے

مجھے کل تک بہت خواہش تھی خود سے گفتگو کی
میں چھپتا پھر رہا ہوں آج اپنے آپ ہی سے

تکرارِ ساعت

وہ بے کیفی کا عالم ہے کہ دل یہ چاہتا ہے
کہیں روپوش ہو جاؤں اچانک خامشی سے

سکونِ خانۂ دل کے لیے کچھ گفتگو کر
عجب ہنگامہ برپا ہے تری لب بستگی سے

تعلق کی یہی صورت رہے گی کیا ہمیشہ
میں اب اُکتا چکا ہوں تیری اس وارفتگی سے

جو چاہے وہ ستم مجھ پر روا رکھے یہ دنیا
مجھے یوں بھی توقع اب نہیں کچھ بھی کسی سے

ترے ہونے نہ ہونے پر کبھی پھر سوچ لوں گا
ابھی تو میں پریشاں ہوں خود اپنی ہی کمی سے

رہا وہ ملتفت میری طرف پر اُن دنوں میں
خود اپنی سمت دیکھے جا رہا تھا بے خودی سے

تکرارِ ساعت

کوئی خوش فکر سا تازہ سخن بھی درمیاں رکھ
کہاں تک دل کو بہلائیں میں تیری دل کشی سے

کرم تیرا کہ یہ مہلت مجھے کچھ دن کی بخشی
مگر میں تجھ سے رخصت چاہتا ہوں آج ہی سے

وہ دن بھی تھے تجھے میں والہانہ دیکھتا تھا
یہ دن بھی ہیں تجھے میں دیکھتا ہوں بے بسی سے

ابھی آنکھوں کو بہت کچھ دیکھنا ہے
تمہیں بے رنگ کیوں لگنے لگا ہے سب ابھی سے

تکرارِ ساعت

زندہ ہوں اور ہجر کا آزار تک نہیں
وہ کام کر رہا ہوں جو دشوار تک نہیں

اب میں ہوں اور تجھ کو منانے کی جستجو
کچھ بھی نہیں ہے راہ میں، پندار تک نہیں

یعنی مرا وجود ہی مشکوک ہو گیا
اب تو میں اپنے آپ سے بیزار تک نہیں

لَو بھی تھکن سے چُور ہوئی ہے، دماغ بھی
اور آسماں پہ صبح کے آثار تک نہیں

تکرارِ ساعت

اقرار کر کے اُس کو نبھانا کسے نصیب
اس عمر میں تو مہلتِ انکار تک نہیں

تھی جس کی پور پور مری لمس آشنا
اب یاد اُس کے گیسو و رخسار تک نہیں

اس بے کراں خلا میں نگاہوں کو کیا کروں
اب تو نظر کے سامنے دیوار تک نہیں

تکرارِ ساعت

تخیل اور ہے، نا دیدہ بینی اور ہوتی ہے
یہ تنہائی ہے بس، خلوت نشینی اور ہوتی ہے

عجب دھڑکا لگا رہتا ہے دل کو اُس کی فرقت میں
مگر وہ پاس ہو تو بے یقینی اور ہوتی ہے

سیہ چشمی حسینوں کی تو ویسے بھی قیامت ہے
مگر پاسِ حیا کی سرمگینی اور ہوتی ہے

گریز اُس کا بجائے خود ادائے خاص ہے لیکن
خمارِ وصل کی ناز آفرینی اور ہوتی ہے

تکرارِ ساعت

نہیں مشروط کارِ عاشقاں ترکِ سکونت سے
میاں، اہلِ جنوں کی نامکینی اور ہوتی ہے

ہمیں اہلِ جہاں ویسے تو کب کیا کچھ نہیں کہتے
مگر احبابِ دل کی نکتہ چینی اور ہوتی ہے

زندگی ہم سے ہی روشن ہے یہ آئینہ ترا
ہم جو مشاطۂ وحشت کے سنوارے ہوئے ہیں

تکرارِ ساعت

بہت خجل ہیں کہ ہم رائگاں بھی زندہ رہے
جہاں پہ تُو بھی نہیں تھا وہاں بھی زندہ رہے

عجیب شرط ہے اس بے یقیں مزاج کی بھی
کہ تُو بھی پاس ہو تیرا گماں بھی زندہ رہے

تجھے یہ ضد ہے مگر اس طرح نہیں ہوتا
کہ تُو بھی زندہ رہے داستاں بھی زندہ رہے

وہ کون لوگ تھے جن کا وجود جسم سے تھا
یہ کون ہیں جو پسِ جسم و جاں بھی زندہ رہے

تکرارِ ساعت

جو یہ نہ ہو تو سخن کا کوئی جواز نہیں
ضمیر زندہ رہے تو زباں بھی زندہ رہے

یہ کائنات فقط منفعت کا نام نہیں
یہاں پہ کوئی برائے زیاں بھی زندہ رہے

عدم میں جو بھی نہیں تھا وہ سب وجود میں تھا
یہ ہم ہی تھے جو کہیں درمیاں بھی زندہ رہے

تکرارِ ساعت

پھر خون میں وحشت رقصاں ہے تجدیدِ ستم کرنے کے لیے
اک تازہ زخم کی خواہش ہے اک صدمہ کم کرنے کے لیے

ہم دن بھر دنیا داری میں ہنس ہنس کے باتیں کرتے ہیں
پھر ساری رات پگھلتے ہیں اک اشک رقم کرنے کے لیے

وہ وصل کہ جس نے ہم دونوں کو ایسے بے بنیاد کیا
اب فرصت ہے آ مل بیٹھیں اُس وصل کا غم کرنے کے لیے

اک کاری زخم کی چاہت نے کیا کیا نہ ہمیں گلزار کیا
ہم کس کس سے منسوب ہوئے اک ہجر بہم کرنے کے لیے

تکرارِ ساعت

انسان کے جینے مرنے کے مجبوری کے مختاری کے
یہ سارے کھیل ضروری ہیں تعمیرِ عدم کرنے کے لیے

بڑھ کے آغوش میں بھر لے ہمیں اے روحِ وصال
آج ہم پیرہنِ خاک اتارے ہوئے ہیں

تکرارِ ساعت

ایسا احوال محبت میں کہاں تھا پہلے
دل تھا برباد مگر جائے اماں تھا پہلے

ایک امکان میں روپوش تھا سارا عالم
میں بھی اُس گردِ تحیّر میں نہاں تھا پہلے

ایک خوشبو سی کیے رہتی تھی حلقہ میرا
یعنی اطراف کوئی رقص کناں تھا پہلے

اُس نے مجھ سا کبھی ہونے نہ دیا تھا مجھ کو
کیا تغیّر مری جانب نگراں تھا پہلے

تکرارِ ساعت

اب فقط میرے سخن میں ہے جھلک سی باقی
ورنہ یہ رنگ تو چہرے سے عیاں تھا پہلے

کون مانے گا کہ مجھ ایسا سراپا تسلیم
سر برآوردہ آشفتہ سراں تھا پہلے

کون یہ لوگ ہیں نا واقفِ آداب و لحاظ
تیرا کوچہ تو رہِ دل زدگاں تھا پہلے

اب تو اک دشتِ تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں
کیسا قلزم میرے سینے میں رواں تھا پہلے

اب کہیں جا کے یہ گیرائی ہوئی ہے پیدا
تجھ سے ملنا تو توجہ کا زیاں تھا پہلے

میں نے جیسے تجھے پایا ہے وہ میں جانتا ہوں
اب جو تُو ہے یہ فقط میرا گماں تھا پہلے

تکرارِ ساعت

جانے ہے کس کی اداسی مری وحشت کی شریک
مجھ کو معلوم نہیں کون یہاں تھا پہلے

دل ترا راز کسی سے نہیں کہنے دیتا
ورنہ خود سے یہ تعلق بھی کہاں تھا پہلے

اب جو رہتا ہے سرِ بزمِ سخن مہر بہ لب
یہی عرفان عجب شعلہ بیاں تھا پہلے

تکرارِ ساعت

دم بخود میری انا تیری ادا بھی دم بخود
تیرے پہلو میں رہا میں اور رہا بھی دم بخود

دیکھئے پہلے لہو ٹپکے کہ پھیلیں کرچیاں
دم بخود تیری نظر بھی آئنہ بھی دم بخود

اتنا سناٹا ہے کہ جیسے اوّلیں شامِ فراق
دم بخود ہے آسماں بھی اور ہَوا بھی دم بخود

یاد ہے تجھ کو وہ پہلے لمس کی حدّت کہ جب
رہ گئی تھی دفعتاً تیری حیا بھی دم بخود

تکرارِ ساعت

ایک سے عالم میں دونوں مختلف اسباب سے
دم بخود تیرا کرم میری دعا بھی دم بخود

ایسا لگتا ہے کہ دونوں سے نہیں نسبت مجھے
دم بخود عمرِ رواں سیلِ فنا بھی دم بخود

رقص کرنے پر تلی ہیں ہجر کی ویرانیاں
دم بخود سارے دیے بھی غم کدہ بھی دم بخود

جب کھلے میری حقیقت تم وہ منظر دیکھنا
دم بخود نا آشنا بھی آشنا بھی دم بخود

تکرارِ ساعت

مری کم مائیگی کو ترے ذوق نے دولتِ حرفِ تازہ بیاں سونپ دی
میں کہ ٹھہرا گدائے دیارِ سخن مجھ کو یہ ذمہ داری کہاں سونپ دی

قاصدِ شہرِ دل نے مرے خیمۂ خواب میں آ کے مجھ سے کہا جاگ جا
بادشاہِ جنوں نے تجھے آج سے لشکرِ اہلِ غم کی کماں سونپ دی

میرا ذوقِ سفر یوں بھی منزل سے بڑھ کر کسی ہمرہی کا طلب گار تھا
اس لیے وصل کے موڑ پر ہجر کو اُس نے رہوارِ دل کی عناں سونپ دی

تشنگی کو مرے شوق کی لہر نے کس سرابِ نظر کے حوالے کیا
کیسے بنجر یقیں کو مرے خواب نے اپنی سرسبز فصلِ گماں سونپ دی

تکرارِ ساعت

احتیاطِ نظر اور وضعِ خرد کے تقاضوں کی تفصیل رہنے ہی دے
یہ مجھے بھی خبر ہے کہ میں نے تجھے اپنی وارفتگی رائگاں سونپ دی

اپنے ذوقِ نظر سے تری چشمِ حیراں کو تازہ بہ تازہ مناظر دیے
تیرے پہلو میں دھڑکن جگانے کی خاطر ترے جسم کو اپنی جاں سونپ دی

رازداری کی مہلت زیادہ نہ ملنے پہ احباب سب مجھ سے ناراض ہیں
قصہ گو مجھ سے خوش ہیں کہ میں نے انہیں ایک پُر ماجرا داستاں سونپ دی

میری وحشت پسندی کو آرائشِ زلف و رخسار و ابرو کی فرصت کہاں
تُو نے کس بے دلی سے یہ امید کی یہ کسے خدمتِ مہ وشاں سونپ دی

دل پہ جب گُل رُخوں اور عشوہ طرازوں کی یلغار کا زور بڑھنے لگا
میں نے گھبرا کے آخر تری یاد کو اپنی خلوت گہِ بے اماں سونپ دی

کارگاہِ زمانہ میں جی کو لگانے سے آخر خسارہ ہی مقدور تھا
یہ بھی اچھا ہوا میں نے یہ زندگی تیرے غم کو برائے زیاں سونپ دی

تکرارِ ساعت

اُس نے ذوقِ تماشا دیا عشق کو خوشبوؤں کو صبا کے حوالے کیا
مجھ رفاقت طلب کو نگہبانیٔ دشتِ وحشت کراں تا کراں سونپ دی

مجھ میں میرے سوا کوئی تھا جو ہوس کے تقاضے نبھانے پہ مائل بھی تھا
میں نے بھی تنگ آ کر اُسی شخص کو ناز برداریٔ دلبراں سونپ دی

ایک امکان کیا گنگنایا مرے چند اشعار میں حرفِ اظہار میں
میں یہ سمجھا خدائے سخن نے مجھے مسندِ بزمِ آئندگاں سونپ دی

تکرارِ ساعت

یہاں تکرارِ ساعت کے سوا کیا رہ گیا ہے
مسلسل ایک حالت کے سوا کیا رہ گیا ہے

تمہیں فرصت ہو دنیا سے تو ہم سے آ کے ملنا
ہمارے پاس فرصت کے سوا کیا رہ گیا ہے

ہمارا عشق بھی اب ماند ہے جیسے کہ تم ہو
تو یہ سودا رعایت کے سوا کیا رہ گیا ہے

بہت نادم کیا تھا ہم نے اک شیریں سخن کو
سو اب خود پر ندامت کے سوا کیا رہ گیا ہے

تکرارِ ساعت

بہت ممکن ہے کچھ دن میں اسے ہم ترک کر دیں
تمہارا قرب عادت کے سوا کیا رہ گیا ہے

کہاں لے جائیں اے دل ہم تری وسعت پسندی
کہ اب دنیا میں وسعت کے سوا کیا رہ گیا ہے

سلامت ہے کوئی خواہش نہ کوئی یاد زندہ
بتا اے شام وحشت کے سوا کیا رہ گیا ہے

کسی آہٹ میں آہٹ کے سوا کچھ بھی نہیں اب
کسی صورت میں صورت کے سوا کیا رہ گیا ہے

بہت لمبا سفر طے ہو چکا ہے ذہن و دل کا
تمہارا غم علامت کے سوا کیا رہ گیا ہے

اذیّت تھی مگر لذّت بھی کچھ اس سے سوا تھی
اذیّت ہے اذیّت کے سوا کیا رہ گیا ہے

تکرارِ ساعت

ہمارے درمیاں ساری ہی باتیں ہو چکی ہیں
سو اب اُن کی وضاحت کے سوا کیا رہ گیا ہے

بجا کہتے ہو تم ہونی تو ہو کر ہی رہے گی
تو ہونے کو قیامت کے سوا کیا رہ گیا ہے

شمار و بے شماری کے تردّد سے گزر کر
مآلِ عشق وحدت کے سوا کیا رہ گیا ہے

عرفان ستار کی شاعری آبرومند شاعری ہے اور یہ آبرومندی روایت کے مطالعے اور شعور سے پیدا ہوئی ہے۔ اس نے جہاں جہاں ترکیب وضع کی ہے اس کا خمیر بھی روایت سے اٹھا ہے۔ مثلاً غالب کی ترکیب "تکرارِ تمنا" سے "تکرارِ ساعت" تک کے سفر نے عرفان کی شاعری کو جدید حسیت سے ہم کنار کیا ہے۔ مصرعوں کی بنت ہی کسی شاعر کی انفرادیت کی ضامن ہوتی ہے اور یہ ضمانت عرفان ستار کی شاعری میں موجزن ہے۔ ایسی صورتِ حال میں جب ہر طرف اتباعی اور ایک پرتی شاعری نہ صرف مقبولیت حاصل کر رہی ہے بلکہ اسے بظاہر اعتبار بھی میسر آ رہا ہے، ایک نئے شاعر کے ہاں فکری توانائی اور روایتی شعور کے ساتھ جدید حسیت کے مظاہر اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ شاعر اپنی اصل میں خالص ہے۔ عرفان ستار کی شاعری مستقبل میں جھانکتی ہوئی پروقار شاعری ہے جس کی آنچ مختلف ہے۔ ایسی آنچ، جو نہ صرف شاعر کے ہم عصروں کو، بلکہ تازہ واردانِ بساطِ غزل کو بھی تخلیقی حدت فراہم کرتی رہے گی۔ رسا چغتائی

ISBN 978-81-928061-3-6

DEHLEEZ PUBLICATIONS